

تماشائی

ویریندر پٹواری

تماشائی

ویریندر پٹواری

جی۔این۔کے۔پبلی کیشنز

TAMASHAI

by

Veerinder Patwari

Year of 1st Edition 2022
ISBN 978-93-91606-31-2
Price Rs. 350.00

نام کتاب : تماشائی
مصنف : ویریندر پٹواری
قیمت : 350 روپے
سنِ اشاعت : 2022
صفحات : 192
تعداد : 500
مطبع : جی۔این۔کے۔پرنٹرس، نئی دہلی

Published by

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
Mobile : 7006738304, 9541123110
E-mail : gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com

انتساب

بقول میرے آنجہانی والد، پنڈت پریم ناتھ پٹواری 'مسرور کشمیری' زندگی آہ اور واہ سے جڑے چشم دید واقعات کا ایک تماشہ ہے! اگر تماشیوں میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ انکے پوتیوں اور پوتوں کو بھی شامل کیا جائے تو تماشوں کا سلسلہ ایک داستاں ء حقیقت بن جاتی ہے!

اپنے دانشور ابا حضور کے قول کا احترام کرتے ہوئے، آج کی زمینی حقیقت کو آنے والے کل عیاں و بیاں کی خاطر میری 44 عدد کہانیوں کا تازہ ترین مجموعہ 'تماشائی'!

ونشی سپرو، کارتک پٹواری اور ہرشل پٹواری

کے نام!

ویریندر پٹواری

فہرست



ویریندر پٹواری میری نظر میں

بحیثیت افسانہ نگار ویریندر پٹواری ایک ممتاز حیثیت کی حامل شخصیت ہے۔ یہاں پر راقم الحروف نے عنوان بڑا دیا ہے۔ تاہم اس عنوان کے ساتھ قطعی انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ویریندر پٹواری کی مختلف النوع جہات اور متنوع ادبی صفات کو کیا ایک صفحے میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ بالکل نہیں! جموں وکشمیر بلکہ برصغیر کی جتنی بڑی افسانوی ہستیاں گزری ہیں۔ ویریندر پٹواری کے افسانوں کو ان کے ہم پلہ رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی وسیع و ہمہ گیر شخصیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لیکن قدرت کی کرنی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اگر ویریندر جی کو زندگی میں ایک بڑے حادثے کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوتا تو بلاشبہ وہ اس وقت اردو افسانے کا تابندہ ستارہ ہوتے۔ تاہم آج بھی وہ اپنے جذبے اور جنون کو قلم کی سیاہی سے رنگ بھرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب وہ بہت فعال اور متحرک تھے۔ ان کے افسانوں کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی شائع ہوتے رہے۔ وہ بیک وقت ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے بھی لکھتے رہے۔ ان کے ڈرامے دور درشن سے ٹیلی کاسٹ ہوئے ہیں اور ریڈیو سے بھی نشر ہوئے ہیں۔ کتابی صورت میں ان کے افسانوی مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان کی مطبوعات میں ''فرشتے خاموش ہیں''، ''آخری دن''، ''آواز سرگوشیوں کی''، ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر''، ''ایک ادھوری کہانی''، ''دائرے''، ''دوسری کرن''، ''افق''، ''آفتوں کے دور میں''، ''انسان''، ''لالہ رخ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ہندی، کشمیری، انگریزی زبانوں میں بھی لکھا ہے۔ لیکن بحیثیت ایک اردو ادیب ان کی شبیہ ادبی دنیا میں بہت مستحکم ہے۔ ان کی پہچان اردو ہے اور اردو زبان وادب سے

ان کا لگاؤ اور شغف قابلِ داد و تحسین ہے۔

ویریندر پٹواری کے افسانوں کے تعلق سے سات سال قبل میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جو آج تک نہ میں نے ٹائپ کیا ہے اور نہ اسے شائع کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اتفاق کہیے یا میری بدقسمتی، جو اردو فکشن کے اس جیالے فن کار کی پذیرائی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ویریندر جی کے افسانوں کے تعلق سے بہت جلد کچھ نہ کچھ تحریر کروں گا۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے ماحول اور کشمیریت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی سرپرستی سے ہم محروم رہے جس کا ہمیں بڑا قلق ہے اور جس کی تشنگی باقی رہے گی۔ پیشِ نظر مجموعے کے افسانے قارئین کو مطالعہ کی دعوت ہیں۔ اس کے بعض افسانے فکر انگیز ہیں جو قاری کی فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔ ان سے ویریندر جی کی تخلیقی فن کاری کا پتہ چلتا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ موصوف کا قلم سویا نہیں پڑا ہے۔

ڈاکٹر غلام نبی کمار

ایڈیٹر کتابی سلسلہ ''پنج آب''



تماشائی

دونوں کے شناسا چہرے عالمی ناظرین کی توجّہ کا مرکز بن جاتے ہیں!۔ کبھی سنسنی خیز سیاسی تماشاوں کا خالق بن کر اور کبھی نتائج سے بوکھلایے ہویے مکّار و عیّار خاموش تماشائی بن کر!۔

ایک بیباک صحافی ہے جسکو یقین ہے کہ وہ صحافت کے آئینہ میں سبھی واقعات کے عکس دکھا کر سہی حالات کی ترجمانی کرنے کا دعوا کر رہا ہے!۔ دوسرا مقبول عام ہونے کا دعوا کرنے والا وہ شخص ہے جسکا سوانحی خاکہ صحافی تازہ ترین حالات سے جوڑ کر یوں بیان کرتا رہا ہے گویا ایک طبیب درد کی شدّت سے تڑپ رہے مریضوں کو درد دینے والے کا حلیہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو!۔

ماضی کے بیشتر تواریخی واقعات کے حوالے دیکر وہ یہ ثابت کر چکا ہے کہ سیاسی جدو جہد کیے بغیر اپنی خاندانی شناخت کے دم پر وہ عالم کی توجّہ کا مرکز بن کر مسیحائی رہبر بن چکا ہے۔ مایل اقتصادی ہوں یا دفاعی، سماجی بہبودی کے ہوں یا سیاسی نوعیّت کے، وہ جدو جہد کرنے والے انقلابیوں کے ہر کارواں کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہو چکا ہے۔ تحریک کامیاب رہی تو وہ اپنی شمولیت کی احمیت کے حوالوں سے خود کو غریبوں، کسانوں، پسماندہ اقلیّتی طبقوں اور بیروزگار نوجوانوں کا خودساختہ ترجمان بن جاتا ہے۔ مگر جب کسی نہ کسی وجہہ سے احتیجاج کرنے والوں کا کارواں بکھر کر ایک منتشر ہجوم بن جاتا ہے تب وہ ایک بے غرض تماشائی کی طرح غایب ہو جاتا ہے۔

بار بار عوام کی نظروں سے دور رہ کر یہ احساس دلاتا رہتا ہے گویا ایک مہاتما کی طرح عالم کی خوشحالی کے لیے تپسیا کرنے چلا گیا ہے!۔ اور ہر بار اپنی پر اثرار خاموشی کو یوں توڑ دیتا ہے گویا اپنے بیانات سے کسی سنسنی خیز سیاسی طوفان کی اطلاح دی ہو۔ تا کہ وہ سرخیوں میں رہ

سکے۔ اسکی ذہنی کیفیت سے آشنا شناسا صحافی جانتا ہے کہ وہ اپنی فطرت سے جڑی خواہشات اور خصلت سے ابھری تدبیروں کی عمل سے عوام کی چنی ہویی سرکار کی مخالفت بغرض مخالفت کر رہا ہے۔ حقیقتاً گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر اسکی چالبازی ذی ہوش ناظرین سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ یقیناً وہ یہ جان چکے ہیں کہ وہ جو بھی کر رہا ہے وہ کہیں ملک میں یا پردیس میں چھپ کر بیٹھے ڈرامہ نگار/ ہدایتکار کا مقصداً تحریر کردہ مسودہ ہے۔ اور ہدایتکار کے عملاً اشارے پر ہی ملک کے کونے کونے میں موجود اپنایے گیے انعام یافتہ دانشور یا مفکّر، وکیل وصحافی اور چند مخصوص یونیورسٹیوں کے نڈر طلبا و پروفیسر مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔

ماضی میں سرکاری انعامات اور اعزازات سے نوازے تخلیق کار بھی ڈرامایی مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ ’کرونا وایرس‘ کے قہر انگیز نتایج اور وبا کے خدشات کی چار سو پھیلی خوفناک دھند کی آڑ میں بھی وہ عوام کو بار بار چونکاتا رہتا ہے۔ ہر بار اپنے چند وفادار ملازموں کے درمیان رہکر جھوٹ کی سجاوٹ سے اپنی عوام پروری کی دکھاوٹ سے یہ ظاہر کرتا رہتا ہے گویا وہ بے صبری سے انتظار کر رہے اپنے لاکھوں مدّاحوں سے مخاطب ہے!۔ اور ڈرامایی انداز میں اپنے ہاتھ ہلاتے اور مسکراتے ہویے وہ ایک فاتح کی طرح چلتے چلتے عالمی ٹیلیوژن کے ناظرین کو یہ احساس دلاتا رہتا ہے گویا وہ منزل مقصود کے بہت قریب ہے۔ مگر ٹیلیوژن کے ہی رابطے سے حقیقی واقعات سے آشنا کروڑوں ناظرین بناوٹی داستانیں سنتے سنتے اوب گیے ہیں!۔

نتیجتاً شناسا صحافی جانتا ہے کہ شناسا رہبر اپنائیت کی آڑ میں گمراہ کن پیغامات دینے والا فتنہ گر زمینی حقیقت سے آشنا نہیں ہے۔ ہواوں کا رخ بدلنے والے اپنے چند حمایتی سیاستدانوں کی تالیاں سنتے ہویے جمہوری سرکار کی اونچی اڑان لے چکی پتنگ کو کاٹنے کے خواب دیکھنے والا یہ نہیں جانتا ہے کہ اسکے ہاتھ میں کچّے دھاگوں کی ایسی ڈور ہے جو اسکی اپنی پتنگ کی اڑان لیتے ہی ہوا کے دباو سے خود ہی ٹوٹ جایگی۔ پھر اسکی پتنگ جھوٹ کے بوجھ سے جب گر جایگی تب کوئی ہنگامہ نہیں ایک قابل دید تماشہ ہوگا!۔

یقیناً عالم کے ذی ہوش ناظرین تب تماشائی ہونگے !!!!!



جمود!

اپنی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ایک پرائمری اسکول کے استاد کو اپنے شہر کی جانی پہچانی سڑکوں پر چلتے چلتے جب کوئی بآوازِ بلند 'ماسٹر جی' کے لقب سے آواز دیتا ہے تب وہ مڑ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں! مگر سرگوشیوں میں 'گورو جی' سن کر وہ چونک کر اجنبیوں کو بھی اپنایت کا احساس دلا کر کسی نہ کسی کا ہاتھ تھام کر، برسوں سے، اپنے ذہنی جمود کے باوجود اپنے گھر پہنچ جانے کے عادی ہو چکے ہیں! مگر پردیس میں ملازمت کر رہے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے آئے، اجنبی شہر کے انجانے راستوں پر کھو چکے ماسٹر جی نے اس بار، ایک بھارتی ڈاکٹر کو اس کے نام سے آواز دے کر چونکا دیا ہے! شناسا سا شاگرد کو پانڈو ارجن اور خود کو 'درون آچاریہ' مان کر گویا نظروں کے تیر چلا کر اپنایت کا احساس دلا کر اسکول کی یادیں تازہ کر دی ہیں! مگر ڈاکٹر کی پوچھ تاچھ کو ٹال کر اور اپنے بیٹے کے بارے میں جانکاری دینے کی بجائے وہ سنجیدگی سے اپنے شاگرد سے مخاطب ہو کر، اسکو 19 کا پہاڑا سنانے کی فرمائش کر بیٹھا ہے!! افسردہ شاگرد استاد کی ذہنی کیفیت بھانپ چکا ہے! مگر چاہتے ہوئے بھی اپنے منطقی جمود کو توڑ نہیں پا سکا ہے!!



آدم

نہ کہیں ندی نالوں میں اچھلتا ہوا پانی تھا اور نہ کہیں کوئی پرسکون جھیل یا مہا شانت ساگر، بس آسمان سے انگارے برس رہے تھے اور زمین سے لاوا اُبل رہا تھا۔ ہواؤں میں قیامت کی تپش تھی اور آدم کی سانسوں میں راحت پانے کے لئے صدائیں۔

”خدایا۔! میری خطا معاف کر دے۔ واقعی میں گنہگار ہوں۔ اس بار زندگی کی بھی دے۔ توبہ کرتا ہوں۔ اب نہ تو تیری زمین کو چھلنی کروں گا اور نہ پانی کو سکھاؤں گا۔ اس بار بخش دے میرے خدایا۔۔۔!

اس کی آنکھیں پانی کی متلاشی تھیں اور چمکتی ہوئی ریت میں امید کی کرنیں نظر آرہی تھیں۔ وہ کرنوں کا تعاقب کر رہا تھا مگر اس کے اُونٹ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ریگستان کا فریب ہے اس لئے وہ تیزی سے سراب کی طرف نہیں بلکہ نخلستان کی طرف جا رہا تھا۔

اچانک اُونٹ کا پاؤں ریت میں دھنس گیا اور وہ اپنے پیروں کے نیچے دبے ہڈیوں کے پنجرے کو دیکھ کر چونک پڑا۔ یوں لگا جیسے وہ ریت میں نہیں بلکہ آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا ہو۔ کیا واقعی قیمت کا دن آگیا ہے اور میرے چہرے پر بھی گوشت نہیں ہے۔ ایک آہ بھر کر اونٹ نے ہڈیوں کے پنجرے کو چوما تو ہڈیاں حرکت میں آنے لگیں۔ اور ایک آواز نے اُونٹ کو چونکا دیا۔ آواز میں غصہ تھا تلخی تھی اور تڑپ بھی۔

اُونٹ!۔ میرے ہمدم، میرے دوست غور سے سن لے۔ اتنی تیز گامی اچھی نہیں۔ آخر اس وفاداری کا کیا انعام ملے گا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا سہارا ایک انسان ہے۔

''ہاں!'' اُونٹ نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا میں انسان کی زبان سمجھ لیتا ہوں۔اُس کی کیفیت بھی بھانپ لیتا ہوں۔جانتے ہو۔اگر اس انسان کو فوراً پانی نہیں ملا تو وہ اپنی تیز چھری سے میرا گلا کاٹ لے گا۔میرے خون سے اپنی پیاس بجھادے گا۔مجھے جانے دو میرے مردہ بھائی۔اس سے پہلے تم تو جانتے ہو بھائی۔میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔بہت ہی معصوم، پیارے پیارے۔''

ہڈیوں کے پنجرے نے کروٹ لی اور زور کا قہقہہ لگا دیا۔یوں لگا جیسے تیز آندھی چلنے لگی۔اور ایک دردناک آواز کہیں سے اُڑ کر قریب سنائی دی۔

''پیاس بجھ جائے گی تو تمہارے مالک کو بھوک کا احساس ہوگا۔سوچو ذرا۔ان بیابانوں میں تمہارے کلیجے کے بغیر کونسی چیز اس کی بھوک مٹا سکتی ہے۔یہاں نہ انسان ہے اور نہ کوئی دشمن۔نہ کوئی چرند ہے اور نہ کوئی پرند۔یہاں ریت ہے اور بکھرے پڑے بموں کے خول۔''

آسمان پر بیٹھا خدا تذبذب میں تھا کہ کیا کیا جائے۔آدم کو اس بار بھی چھوڑ دیا جائے یا ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے مگر اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کر پاتا انسان کو ایک بالکل نیا بم بنانے کا موقع مل چکا تھا۔اور بے چارہ اُونٹ ہانپتا ہوا کانپتا ہوا نخلستان کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے!!



کاش

انتقامی سیاست کی شطرنجی کھیل میں دھرنوں، مظاہروں سے ابھرے فتنے اور فسادوں کی اہمیت اور طاقت سے آشنا انقلابی طالب علم بیرونی ممالک کی مداخلت اور اندرونی انتشار سے ارداتاً اُبھارے گئے اقتصادی، دفاعی اور سماجی مسائل سے جڑی سیاست سے آشنا ہے!

عالمی ٹیلی ویژن کی خصوصی بحثوں میں دانشمندی، دور اندیشی اور معلومات کا دعویٰ کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں اپنی بلند آواز سے جمہوری نظام میں عوام کے چنے ہوئے حکمرانوں کے حق میں یا پھر اُن کی مخالفت باغرض مخالفت کرنے والے آئینی یا پھر آئین میں درج حقوق کے حوالے دے کر اپنی سیاسی موافق کو عیاں کرتے ہوئے اپنی اہمیت سے چونکنے والے شناسا چہروں سے بھی آشنا ہیں!

فرقہ پرستوں کی چار سو پھیلائی گئی وحشت کی گمراہ کن اور اُکسانے والی دُھند سے اُبھری دہشت کی تپش سے بستیوں میں اُجڑ چکی مکین کی سپردِ خاک ہونے والوں میں اپنے بھائی کے عبرت ناک قتل سے خوفزدہ ''کورونا'' وائرس سے بچنے کی خاطر احتیاطاً بھیڑ بھاڑ سے دور رہنے کی خاطر گھر میں ایک کولہو کے بیل کی طرح چکر لگاتے ہوئے حکمرانوں کے حق اور مخالفت کرنے والے دونوں سیاست دانوں کو پیغامات دیتا رہتا ہے۔

''کاش جان لیوا ہاتھوں سے ہاتھ ملانے والے سیاسی وائرس کو بھی کورونا وائرس کی طرح سنجیدگی سے لیا ہوتا؟''



اچانک!

اپنے مکان میں راشن کے گودام کی حفاظت کرنے والی پالتو بلی اپنے پڑوسیوں کے گھروں میں آتی جاتی بلیوں سے مل کر یہ جان چکی ہے کہ سرکاری کرفیو میں اپنے قدیم مکان کے مکین کے ساتھ ان کے سبھی محلے والے، شہر والے، ریاست والے اور ملک کے سارے باشندے ارادتاً ایک دوسرے سے دور رہ کر اپنے گھروں میں تنہا رہ کر کورونا وائرس کے خلاف اکیس دن کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ اپنا بند دروازہ کھول کر کسی شناسا یا غیر شناسا ملتجی انسان کو اپنائیت کا احساس دلا کر جذبات کی رو میں بہہ کر دوریوں کو مٹا دینا یا پھر کسی خود ساختہ ناصح کے خیالات سے ہم آہنگ ہو کر بھیڑ میں شامل ہونا یا تو ایک مجرمانہ غفلت ہے یا پھر مسیحائی کرفیو کو توڑنے کی سنگین سازش ہے۔

قدیم مکان میں مکین کی وفادار بلی پینے کی اشیا کو چوہوں کی یلغار سے بچانے کی خاطر تاک میں بیٹھ کر دبے پاؤں چل کر چوہوں کو اُچھل کر دبوچنے میں ماہر ہے۔ مگر آج سرکاری کرفیو کے آٹھویں دن اناج کی بوری کو کترنے کے بجائے دروازے کو کُتر کر گودام میں داخل ہوئے باہر سائے آئے ہوئے ایک چوہے کو دیکھ کر وہ اچانک چونک پڑی ہے۔ چوہے کو جب کوئی اٹھا کر بچا کر لے گیا تب دروازے کے باہر کھڑے کسی مددگار کو موجودگی اور مقصد کے احساس سے لرز کر وہ اونگنے لگی۔

اونگنے کی آوازیں سن کر قدیم مکان کی دہلیز پہ کھڑا مکین کا پالتو کتا اپنے اردگرد کے چوہوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو چکا ہے! اور پھر ایک غیر شناسا چہرے کو اندھیرے میں غائب ہوتے

دیکھ کر وہ رات بھر بھونکتا رہا ہے۔

گہری نیند سے جاگ پڑے وقدیم مکان کے مکین اور اُن کے پڑوسی رات بھر سوچتے رہے کہ یہ آواز الہام ہے یا انتباہ!



ایک ہی راستہ

قہرانگیز وائرس 'کورونا' کے بیشتر واقعات سے جڑے بے قابو دردناک حالات پر اپنی نگاہیں جمی رکھ کر اپنوں کے خود چنے مسیحائی سنتری اور پاسبان نے اپنائیت کا احساس دلا کر صاف گوئی سے اپنوں کو یہ سمجھا دیا کہ کورونا وائرس کو اب تک نہ کوئی چمتکاری قوت مار سکی ہے اور نہ کوئی ایجادی طاقت اس کو پھیلنے سے روک پائی ہے۔

ماہرین یہ جان پائے ہیں کہ کورونا وائرس اپنے وجود کو فقط انسان کی سانسوں میں پناہ لے کر جب تک زندہ رہتا ہے تب تک وہ نہ کسی کا پیچھا کرتے ہوئے نہ سرگوشیاں سنا کر اور نہ اپنے قدموں کی آہٹ سنا کر چونکا دیتا ہے۔ مگر جب کوئی جغرافیائی قید و بند سے آزاد گورا کالا بد بخت انسان اتفاقاً، غفلتاً یا پھر ارادتاً کسی وائرس کے شکار کے سامنے آجائے تب وائرس کھانس کر گویا دستک دے کر اپنے نئے شکار کی سانسوں میں گھس کر اپنی تباہی کے آغاز سے بے خبر بد بخت کے گلے میں رُک کر جب پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے تب بے قابو لا علاج بیماری اپنے اذیت ناک اثر کو عیاں کر دیتی ہے۔ اور جیسے غفلت کی چنگاری گودام میں رکھی محفوظ روئی کا وجود مٹا دیتی ہے ویسے ہی کورونا وائرس کا شکار ایک بھیڑ میں گھس کر، مہاماری کا محیط پھیل کر ایک سے دو، دو سے چار اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو مار سکتا ہے۔

فکر مند قہر خدا کو رضائے خدا مان کر بے بسی کو قبول کر لینے کے بجائے یہ جانتا ہے کہ غفلتاً لگی آگ یا ارادتاً لگائی گئی آگ ایک جنگل کو راکھ میں بدل کر خود بہ خود بجھ تو جاتی ہے مگر بجھنے سے پہلے اپنے شعلوں سے ساتھ والے جنگل کو دبوچ کر بے قابو ہو کر چار سو پھیل کر تباہی مچا دیتی

ہے!۔ تجربہ کار آگ بجھانے والے، شعلوں کو دبوچنے کے بجائے ان کے پھیلاؤ کو روک کر اردگرد بستیوں کو بچالیتے ہیں۔ شعلے نظر آتے ہیں اور وائرس دکھائی نہیں دیتا ہے! مگر ماہرین یہ مان رہے ہیں کہ اگر کوئی بھی انسان بھیڑ میں سے الگ ہوکر، پڑوسیوں سے بھی دوریاں رکھ کر اپنے گھر میں احتیاطاً اکیس دن علیحدگی اختیار کرلے تو وائرس کے پھیلاؤ کو روکا جاسکتا ہے! گویا مہاماری سے بچنے کا یہ ایک ہی راستہ ہے!

اپنے مسیحائی رہبری کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مقصداً ایک دوسرے سے جدا مگر اپنے پڑوسیوں سے بھی دور رہ کر اعتقاد اور اعتماد سے ۱۳۰ کروڑ ہم وطنوں کی اکیس دن کے ملک گیر کرفیو کا تواریخی آغاز بالکل ویسے ہی ہوا جیسے کرفیو نافذ کرنے والے حکمران نے سوچا تھا! آغاز اچھا ہے تو انجام بھی اچھا ہوگا! یقیناً آنے والی نسلیں یہ سوچتی رہ جائیں گی کہ جمہوری نظام میں عوام کو مہاماری سے بچانے کے لئے عوام کا خود عائد کیا گیا ملک گیر کرفیو ایک ہی راستہ تھا!

بیس دن بعد اُن کی فتح کے سہانے تجسس پر تذبذب کا گرہن لگا دینے کی کوشش کرنے والے انتخابات میں اپنی سیاسی لڑائی ہار چکے شناسا سیاست دان کیا اس بار بھی اپنی گمراہ کن مخالفت بغرض مخالفت کے دلدل میں دھنس کر تواریخ کا حصہ بن جائیں گے؟



بود۔ نابود

اِس بیج کو کون سمجھائے کہ آخر معاملہ کیا ہے! حقیقت کیا ہے! اور افسانہ کیا ہے! حالانکہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے! وہی صدیوں پرانی حکایتیں!!

اس بار بھی جب بے چارے بیج کو کسی نے زمین میں ڈال دیا تب اس کو ایک ڈراوٗنا اندھیرا نظر آیا! یوں لگا جیسے کوئی کالا دیو، چاند دھرتی اور تاروں کو روشنی دینے والے سورج کو نگل گیا ہو! غالباً ویسے ہی لگ رہا ہوگا جیسے ایک مجاہدِ آزادی کو پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر اس وقت لگ رہا ہوگا جس وقت جلاّد اُس کے چہرے کو کالے کپڑے سے ڈھانپ دیتا ہے!

بیج کی یہ کیفیت دیکھ کر زمین نے سرگوشیانہ انداز میں کہا! ڈرو نہیں تم اپنی ماں کی کوکھ میں آگئے ہو! کچھ دیر بعد جب تم ایک ننھے پودے کی شکل میں باہر آوٗ گے تب تمہیں روشنی ہی روشنی نظر آئے گی!! پُر کیف ہوائیں تمہیں اپنی گود میں لے کر جھولا جُھلائیں گے! بارش تمہیں نہلائے گی! بدلتے موسم تمہارے خواب بن کر تم سے آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے! تمہاری خواہشات کا ہاتھ تھام کر رقص کرتے رہیں گے! تم دن کو سورج سے اور رات کو چاند ستاروں سے باتیں کرتے رہو گے! پھر ایک دن تمہاری شاخوں سے لٹکتا ہوا پھل دیکھ کر میں تم سے پوچھوں گی! اے تناور درخت! یاد ہے وہ دن جب تم ڈر گئے تھے! کوکھ کے اندھیرے سے!

بیج خاموش رہا! کوکھ کی ہلکی ہلکی سی آنچ محسوس کرتے ہوئے وہ انتظار کی گھڑیاں گِنتا رہا اور چپ چاپ بیٹھا رہا!!

اچانک ایک شور برپا ہوا! ایک پرندے نے چونچ مار کر بیج کو باہر نکالا اور وہ کوکھ سے نکل کر اس کے پیٹ میں چلا گیا! بیج کچھ بھی نہ کہہ پایا! مگر دھرتی چیخ پڑی! اُس کا حمل گر چکا تھا!!؟؟

دشمن

اُف اُف کی آواز جب تکرار اختیار کرگئی تو اس کے قدم رک گئے اور وقت کا طاقتور ترین انسان ہے ایک ایسا شخص جو دنیا کی کسی کونے میں فقط ایک انگلی اٹھا کر یا ہونٹ ہلا کر ساری کائنات کو ہلا سکتا ہے جس کے قدموں کی آہٹ سے زمین کانپ جاتی ہے، اور پہاڑ تھر تھراتے ہیں اور دریا بہاؤ بدلنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک ایسا شخص ہے جس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹینک نہیں روک سکتے، کیونکہ اس پاس طیارے ہیں، اس کو جنگی طیارے خوفزدہ نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کے پاس طیارہ شکن میزائل ہیں۔ اس کے پاس طرح طرح بم ہیں، آگ برسانے والے، زہریلی گیس پھیلانے والے، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، کوبالٹ بم اور اتنی بڑی طاقت کے سامنے ایک کتے کی کیا حیثیت! یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگا! اور قہقہے لگانے لگا— !

لیکن اچانک کتے کے بڑھتے قدم، نوکیلے دانت، قہر آلود نگاہیں دیکھ کر اس کے قدم پیچھے ہٹتے گئے! پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے — ! بے بس وہ کر ہانپنے لگا! کانپنے لگا اور دوڑتے دوڑتے اپنے بچاؤ کی خاطر جھاڑیوں کے پیچھے کھو کھلے درختوں کے اندر چھپتا رہا! مگر کتا ایک آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا! دوڑتے دوڑتے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کتے کی رفتار میزائل سے بھی زیادہ تیز ہے! کتے کی بھوں بھوں کی آواز بم کے دھماکوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ سے بھی زیادہ بھیانک ہے! موت اس کا پیچھا کرتی رہی اور وہ بھاگتا رہا!!

اچانک کتا خاموش ہو گیا! ایک نوکیلے پتھر نے ایک ہی وار میں کتے کا کام تمام کر دیا

تھا! اور ایک انسان خون سے لت پت کتے کو دیکھ کر قہقہے مارتا رہا سامنے سے گزر کر ایک گار میں گھس گیا!

اپنے تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جب گار میں جھانک کر دیکھا تو صدیوں پرانا انسان اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے! غالباً اس لئے کہ اس کے دشمن وحشی درندے تھے انسان نہیں! اس کے پاس اپنی حفاظت کے لئے پتھر تھے! بم نہیں!!



سوال!

آشا میری اکلوتی بیٹی ہے۔۔۔میں آشا سے بہت پیار کرتا ہوں۔۔۔میں آنکھوں کا مشہور ڈاکٹر ہوں۔۔نامور۔۔۔

آپریشن کامیاب ہے اور چند گھنٹوں کے بعد آشا بیٹی سب کچھ دیکھ سکے گی۔۔۔ واہ۔۔۔واہ یہ کمرہ، یہ مکان،۔۔۔وہ سڑکیں،۔۔۔پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں،۔۔۔ ابلتے چشمے،۔۔۔گرجتے دلکش آبشار،۔۔۔لہلہاتے کھیت،۔۔۔ڈیم،۔۔۔فیکٹریاں۔۔اور اسکا مرجھایا ہوا چہرہ ایک پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔۔۔واہ!۔۔مگر۔۔؟اف۔۔۔!!!۔۔۔!

اس وقت سات بجے ہیں۔۔۔بلیک آوٹ آٹھ بجے ہے۔اور نو بجے جب میں آشا کی پٹّی کھول دونگا۔۔۔تب ہر طرف ڈراونا اندھیرا چھایا ہوگا۔سکوت کا عالم ہوگا۔۔۔اور۔۔ کوئی ایٹمی دھماکوں کی آواز سن رہا ہوگا۔۔کوئی قہقہے۔۔۔کوئی آہیں۔۔۔کوئی ریڈیو کو کان سے لگائے امریکہ، روس، ایران، افغانستان، چین کی خبریں سنتا ہوگا۔۔۔اور میں فقط اپنے پھولتے سانسوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی کرتے ہوئے گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سن رہا ہونگا۔۔۔بے بس۔۔۔لاچار۔۔۔دل شکستہ۔۔۔شکست خوردہ۔۔۔میں سوچ رہا ہوں۔۔۔تھوڑی دیر بعد آشا کی پٹیاں کھل جائینگی۔۔۔لیکن اس اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آئیگا۔۔۔وہ گھبرا جائیگی اور مجھ سے یہی سوال کریگی۔۔۔

''مجھے کچھ دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے پاپا۔۔۔؟''

میں اس سے کیسے کہونگا کہ مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔۔۔اف۔۔۔!!



وہ بھولی داستان!

چارسو پھیلے آدم خور وائرس کے قہر سے اپنے وجود کو بچانے کی خاطر، اپنے نیک پڑوسیوں سے دوریاں رکھ کر میں ایک طویل عرصے سے اپنے گھر میں تنہا رہتا ہوں! مگر انقلابی تدبیروں نے پہلی بار ہر ذی ہوش انسان کو تنہا رہتے ہوئے بھی ارادتاً خیالاتی طور پر متحد ہو کر ایک خوشحال کارواں میں شامل ہونے کا احساس دلایا ہے! خوش ہوں کہ ایٹمی ہتھیاروں کی بجائے ویکسین کی ایجاد نے فتح کا بگل بجا کر، انسان کو انسان کے قریب لاکر، رشتوں ناطوں کی شناخت بدل دی ہے! اور قہر آدم کے خلاف ایک انوکھی فیصلہ کن جنگ لڑنے والوں کے جشن میں شامل ترقی پسند اشرف المخلوق کو بین الاقوامی یکجہتی کے مسیحائی کرشمے کا یقین دلایا ہے!

انسان کی جدید کرشماتی ایجاد، گوگل لیپ ٹاپ اور فیس بک کی مدد سے، سرحدی دیواروں کو پھاند کر، نسل اور قوم کی شناخت کو نظر انداز کرنے والے بیشتر ممالک میں آباد دوستوں سے خیالاتی جذباتی اور عملی طور پر ہم آہنگ ہو کر مجھے بھی کارواں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہوں! نتیجتاً جب میں شناسہ دوستوں اور اجنبی دوستی کے طلب گاروں سے ملے پیغامات کا غور سے جائیزہ لیتا ہوں، تب میں اپنی 'گھر واپسی' کے امکانات کو زمینی حقیقت میں بدلنے والوں کے دل کش عکس نظر آتے ہیں! اور اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب کوئی شناسہ یا اجنبی مجھ سے پوچھے کہ بتا تیرے دل میں کیا ہے؟ اور میری کہانی سن کر، میرا ہاتھ تھام کر مجھے گھر واپسی کا راستہ دکھا دے!

میں ایک حقیقت پرور تخلیق کار ہوں! من چاہا معاوضہ لے کر، کسی کے بھی چشم دید

واقعات اور دلچسپ قصوں کو اپنی نظموں کہانیوں ڈراموں اور فلموں کے اسکرپٹوں کی شکل میں ڈھالنے کا عادی ہو چکا ہوں! مگر چاہتے ہوئے بھی اپنی دل میں چھپی باتیں نہ قارئین کو پڑھا سکتا، نہ سامعین کو سنا سکتا اور ناظرین کو دکھا سکتا ہوں!

خوش ہوں کہ آج فیس بک پر ایک فلم کار نے میرے آبائی وطن کے عظیم حکمران بڈشاہ کے، سنہری دور کی تواریخی روایات کے بین القوامی پس منظر میں، اس دور کی دہشت کی یلغاروں سے اکھڑ چکے وادی کے موروثی باشندوں پر ایک فلم بنانے کی اطلاع دی ہے! امریکہ میں فلم سازی کی تربیت پانے والے اجنبی نوجوان نے مجھ سے فلم کی اسکرپٹ لکھنے کی گزارش کی ہے! اور فیس بک پر اسکے ویڈیو پیغام نے گویا ادھ بجھے انگاروں پر موجود راکھ کو پھونک مار کر، میرے سردی سے ٹھٹھر رہے جسم کو سہانی آنچ کا احساس دلایا ہے!

مگر جب ہوش نے میرے جوش پر حاوی ہو کر مجھے اپنے سوزِ نہاں کی شدّت کو محسوس کرا دیا تو میرا کلیجہ منہہ کو آیا ہے! اور پھر وہ بھولی داستان یاد آ گئی جس کی شروعات ستّر برس پہلے تب ہوئی تھی جب میں ایک پانچویں جماعت کا طالب تھا! اور اپنے اسکول کے ثقافتی پروگرام میں ایک فلمی نغمہ گا کر، اسکول کے مالک کے عقابی تعاقب کا شکار بن گیا تھا!

میں نے آٹھ سال کی عمر میں پہلی بار ایک فلم دیکھی تھی! اور تب پہلی بار ایک سنیما ہال کیا ندھیرے میں، ایک بہت بڑے پردے پر اجنبیوں کے سیاہ وسفید بڑے بڑے چہرے دیکھ کر میں ڈر گیا تھا! لیکن نغمے ومکالمے سن کر، رقص دیکھ کر اور کرداروں کا رہن سہن دیکھ کر میں بے حد متاثر ہو کر یہ سوچتا رہا کہ کون ہیں یہ بھلے لوگ جنکی بول چال، گستاخی پر غالب ہونے والی شائستگی، بدّی پر نیکی کی فتح کا یقین دلا رہی ہے!؟ اپنے ہر مسلے کو حل کرنے والے، اچھے اچھے کپڑے پہننے والوں سے جنونی محبت کی وجہ سے مجھے فلمیں دیکھنے کا چسکہ لگ گیا تھا!

اس روز میں 'سکندر' کی تواریخی فلم دیکھ کر بے حد متاثر ہوا تھا! مگر جب میں، غور سے کہانی سن لینے والے اپنے ہم جماعتی طلبا کو 'پورس' اور 'انبھی' کے بارے میں ذکر کر رہا تھا تب انہوں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر یوں دبوچ لیا تھا گویا میں بھی لوگوں کے پھینکے ہوئے سگریٹ بٹ پی رہا تھا یا جوا کھیل رہا تھا! آگ بگولہ ہو کر اور مجھے 'فلمولا' کا نام دے کر، اسکول کے مالک

نے طلبا کی موجودگی میں، میری ہاتھوں کی انگلیوں میں اپنا قلم ڈال کر زور سے دبا کر ایک اذیت ناک سزا دی تھی!

میں جب درد کی شدّت سے چیخ پڑا تھا تب کلاسوں میں بیٹھے طلبا سکتے میں آگیے تھے!

محلے میں جب بات پھیل گئی تھی تب میرے مرحوم ابّا نے یہ سوچا تھا کہ میری چیخوں کی گونج جدیدیت کے قدردان محلے والوں کی آنکھیں کھول کر، واقعے کی حقیقت سے آشنا کردیں گی! مگر ستم کی شناخت اور تشدّد کے سانحہ کی مذمت کرنے کی بجائے انہوں نے اذیت ناک سزّا کو سبق آموز کارکردی کا نام دے کر، سزّا دینے والے کی اصول پرستی کو اپنی اگلی نسلوں کی رہبری کا عنوان دے کر قبول کرلیا تھا!

عوام پرور مفکر خیر خواہ دانشور دور اندیش رہنما کے القاب سینوازے گئے اسکول کے مالک کوئی سرکاری عہدہ سنبھالے بغیر، طلبا و ماسٹروں کے علاوہ علاوہ محلے میں رہنے والے سبھی سرکاری ملازموں، چھوٹے بڑے دوکانداروں اور گلی کوچوں میں نظر آنے اجنبیوں پر نظریں جمی رکھنے کے عادی تھے! اور اکثر تاک میں بیٹھ کر، کبھی گلی ڈنڈا کھیلنے والے لڑکوں کو جوّا کھیلنے کے مجرم بنا کر بھگا دیا کرتے تھے تو کبھی انکا منہ سونگھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ وہ لوگوں کے پھینکے ہوئے سگریٹ بٹ پینے کے عادی طالب علموں کی شناخت کرنے میں ماہر تھے! بلکہ وہ اکثر بالغوں کو بھی، روک ٹوک کر شراب نوشی پر پابندی لگانے والے محلے کے خودساختہ نگہباں اور معاشرے کا صلاح کار ہونے کے مظاہرے کرتے رہتے تھے!

انکی متوقعہ عبرت ناک سزا سے خوف زدہ، محلے کے معصوم لڑکے، دریا میں نہاتے ہوئے، کھیل کھیلتے ہوئے یا پھر گلیوں میں ٹہلتے ہوئیانکو دیکھ کر بھاگ جایا کرتے تھے! محلے میں آتے جاتے اجنبیوں نے بھی انکو نہ کبھی ہنستے اور نہ کبھی روتے دیکھا تھا! مگر خودساختہ منصف کی معنی خیز سوالیہ مسکراہٹ وجسمانی حرکتوں کی دکھاوٹ اور گفتار سے آشنا انکے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے عادی ہو چکے تھے! رہبری کا دعوی کرنے والے کا ہر فرمان گویا پتھروں پر کریدی لکیریں ہوا کرتی تھیں! مگر جدیدیت کے قددان ترقی پسند بیشتر سمجھدار محلے والے، اپنی تدبیروں کو عمل میں لانیکے ذاتی ارادوں کو پوشیدہ رکھ کر، ضدّی خیر خواہ کی مخالفت یا احتجاج کرنے کی بجائے انکو مصلحتاً

اپنی خوشنودگی رضامندی کا یقین دلاتے رہتے تھے!

میرے مرحوم ابا بھی اپنے ہم عمر نیک پڑوسی کے ہم خیال نہ ہوتے ہوئے بھی انکی مخالفت نہیں کرتے تھے! وہ اطلاعات ونشریات سے جڑے ایک ترقی پسند سرکاری افسر تھے! ذاتی طور پر سماجی ثقافتی اور تواریخی موضوعات پر سیاسی تنقید کرنے کی بجائے تخلیقی حقیقی جایزہ لے کر ہر موضوع پر بے لاگ بحث تبصرے اور بحث کرنے کے عادی تھے! وہ یہ مانتے تھے کہ ہزاروں صفات پر بیان کئے گئے، جدید اور صدیوں پرانے؛ تواریخی واقعات وحالات کو، تین گھنٹے کی فلم میں عیاں کیا جاسکتا ہے! یہ جواز دے کر وہ ماضی کے نمایاں واقعات کو آج کے واقعات سے ابھرے حالات سے جوڑنے کی خاطر، نئی پرانی فلمیں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے!

اس دور میں فلمیں دیکھنا بھی شراب نوشی اور جوّا کھیلنے کے مانند ایک عیب سمجھا جاتا تھا مگر وہ فلم بینی کے حق میں یہ جواز دیتے رہتے تھے کہ قصور تلوار کا نہیں کیونکہ وہ اگر ایک دشمن سے ایک بے گناہ کو قتل کرسکتی ہے تو کسی دوست سے کسی کی جان بھی بچاسکتی ہے! اسلئے اچھے مقصد کیلئے وہ سبق آموز فلموں کی نمائش کو معاشرے کی ضرورت ثابت کرنیکی وکالت کرتے ہوئے مجھے بھی سبق آموز فلمیں دکھاتے رہتے تھے!

فلم بینی کو ایک عیب کی بجائے ایک بہترین تفریح سے جڑے تعلیم وتربیت کا ذریعہ مان کر، برسوں بعد، اپنے دادا اور والد کے نقش قدم پر چل کر؛ میرا بیٹا بھی دس برس کی عمر میں فلمیں دیکھنے لگا تھا! مگر تب فلموں سے نفرت کرنے والے، صدیوں پرانی روایات کے قدردان خدمتِ خلق کے دعویداروں نے بندوق اٹھا کر سنیما ہالوں کو جبراً بند کروادیا!

اور پھر وادی میں مہک رہے گلستانوں کو بنجر بیابانوں میں بدلنے والوں نے سیر و سیاحت پر پابندیاں عاید کردیں! غیروں کی شئے پر، فرقہ پرستی کی سیاست کے منصوبوں کو ثقافتی رنگت دے کر جلسے جلوسوں کی یلغاروں کی گونج سنا کر اپنوں کو ڈرا دھمکا کر للکارتے رہے!

میرے مرحوم والد اکثر یہ سمجھایا کرتے تھے کہ آفتوں کا سامنا کرنے کی کشمکشِ زندگی نیک پڑوسیوں کی اہمیت سے آشنا کرادیتی ہے اور اشرف المخلوق کی مسیحائی قوّت، کرشماتی راحت کا یقین دلادیتی ہے! اپنے ہم عصروں کے چشم دید سنسنی خیز واقعات کا حوالے دے کر ابھرے

بیشتر آفتوں کا ذکر کرتے ہوئے فخر سے یہ بتایا کرتے تھے کہ اگر ستر برس پہلے ہوئے، ملک کے بٹوارے کے فوراً بعد ہوئے کشمیر وادی پر قبائیلی حملہ آوروں کے قتلِ عام کے دوران، صدیوں پرانی صوفی سنتوں کی روایات کو اپنا کر اگر وادی کشمیر کے مذہب پرست امن پسند پڑوسیوں نے، اپنے ہم نفس ہم نوا اقلیتی طبقے کی عقیدت اور جان و مال کی حفاظت نہ کی ہوتی تو انکا وجود مٹ چکا ہوتا!!

مگر تیس برس پہلے، پہلی بار ہمارے نیک پڑوسیوں نے اپنے دیواروں سے ملے دیواروں سے ٹکرا رہی اپنوں کی مدد کی جانی پہچانی صداوں اور دردناک چیخوں کو اپنی پراسرار خاموشی سے دبوچ کر موروثی بسکینوں کو، دریچوں سے جھانک کر انکو اپنے گھروں سے اکھڑتے دیکھا! نیک پڑوسیوں نے، معمول کی طرح، اگر ہماری حفاضت نہیں تو پناہ ہی دی ہوتی تو اقلیتی طبقہ یقیناً ایک سیاسی سازش کے تشدّد کے شکار نہیں ہوا ہوتا! اور اپنایت کا نقاب پہن کر اجنبی حملہ آور فتح کا بگل بجا کر، موروثی باشندوں کو گھروں سے اکھاڑ کر، انکے اجڑے مکانوں کی زمین کے مالک بن جانے کا دعوی نہیں کر سکتے تھے!

اپنی زمین سے دور رہنے رہنے کا صدمہ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر میرے والدین، سرکاری راحتی کیمپ کے خیموں میں جھلس رہی دھوپ کی شدّت برداشت نہیں کر پائے! مگر یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ اکھڑ چکے تمام وطن پرستوں کی طرح میں بھی، اپنے عظیم ملک کی بیشتر ریاستوں میں، پچھلے تیس برسوں سے، اپنے نئے ہم وطن پڑوسیوں کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں! مگر یہ سچ ہے کہ اسّی برس کی عمر میں اپنی بھولی داستان سے جڑے کرب و کراہن کے احساسات کے ساتھ دس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک کے واقعات کا ذکر یوں کرتا رہتا ہوں گویا ایک بے جرم سزا کاٹنے کی وضاحت کر رہا ہوں!

اگر اپنی کہانی کو فلم کے سانچے میں ڈال دوں تو عالم کو میری کہانی دیکھ پائے گا! یہ سوچ کر فلمکار کی، فلم کی اسکرپٹ لکھنے کی گزارش کو قبول کرنے کی اطلاع دینے کے ساتھ، میں نے، عالم سے پوشیدہ اپنی بھولی داستان کو اپنی آواز میں بیاں کرتے ہوئے اپنے وڈیو فیس بک پر پوسٹ کر دیا ہے!

میرے پیغام کا جواب دے کر فلمکار نے اپنے پیغام میں یہ اطلاع دے کر کہ وہ میری کشمکش ئزندگی سے آشنا ہے! اور اپنے انقلابی شاعر باپ سے میری بھولی داستان سن کر، اسنے مجھ سے اسکرپٹ لکھنے کی گزارش کی ہے!

حیران ہوں کہ ترقی پسند فلمکار، 'فلمولا' کا نام دے کر؛ ستر برس پہلے مجھے عبرت ناک سزا دینے والے عوام پرور مفکر خیر خواہ دانشور دور اندیش رہنما کے القاب سینوازے گئے اسکول کیمر حوم مالک کا پوتا ہے!!



پیغام

کہتی ہے خلقِ خدا غایبانہ کیا! یہ جان لینے کی خاطر میں روز لیپ ٹاپ پر فیس بک کے حوالے سے اپنے دوستوں کے علاوہ مجھ سے دوستی کرنے کے شناسہ اور اجنبی دونوں کے پیغامات غور سے پڑھنے کا عادی ہو چکا ہوں! مگر آج پہلی بار اپنے ایک شناسہ ہم عصر ہم وطن کا یہ غیر متوقعہ پیغام پڑھ کر چونک پڑا ہوں!

کرونا وائیرس کے قہر سے بچنے کی خاطر دانستہ طور پر اپنے پڑوسیوں سے بھی دوریاں رکھ کر زندہ رہنے کی انسانی جدوجہد میں اگر موبائل اور فیس بک جیسی ایجادات کی مسیحائی راحت دستیاب نہ ہوتی تو کیا ہوا ہوتا؟ شاید ہم دونوں کے مٹ چکے وجود کی تواریخی داستان بھی تنہائی کے عالم میں آدم خور وائرس کے شکار بے بس انسانوں کا قہر انگیز سانحہ بن گیا ہوتا! اور بند کمروں میں سڑی لاشوں کی بدبو سے شناخت کرنے والے وہ گدّ اور گوشت خور جانور اپنی سرحدیں پھیلانی کی تاک میں بیٹھے خاقان کو انکی غفلتوں کے انجام کا عکس دکھا کر عالم میں انسانوں کے وجود کو نابود کرنے کا احساس دلا کر رنج وغم کو انکی بے بسی کا نام دیتی!

مسیحائی ویکسین کی ایجاد سے متاثر ہو کر جب اشنیا پنے احساسات اور خیالات کے جزباتی اظہار کے ساتھ تقریباً تیس برس بعد میرے گھر آ کر مجھ سے ملنے کا یقین دلایا تو اپنے بچھڑے، ہم وطن، ہم جماعتی ہم پیشہ کی یادیں میرا تعاقب کرتی رہیں!

کاش تم میری مدد کی صدائیں سن کر تب ملنے آتے جب مجھے اور میرے خاندان کے سبھی افراد کو اکھاڑ کر اپنا گھر اور وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر جب میں

نے اپنے ہم عمر پڑوسی کو یہ پیغام بھیج دیا تب اسنے جواباً یہ اطلاع دی کہ وقت کی بیوفائی کو بے بسی اور مجبوری کا نام دیکر ہم دونوں اپنی اگلی نسلوں کو انسانی رشتوں کی قدردانی کا پیغام دے کر اپنے وطن کی ہزاروں برس پرانی 'جیو اور جینے دو!' کی روایات کو رونما کر سکتے ہیں!

کیا خلقِ خدا کا بھی یہی پیغام ہو سکتا ہے؟؟



وقفہ

راجدھانی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے ایک کمرے میں پانچ آدمی اپنے چہروں پر نقاب چڑھا کر، اپنے ہاتھوں میں گلاس لئے، ہوٹل میں دنیا کی اعلیٰ ترین وہسکی نہ آنکھوں سے پی رہے ہیں اور نہ منہ سے لگا کر پی رہے ہیں۔ سبھی ایک فون کال (Phone Call) کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے چہروں پر نمایاں ہو رہے مصنوعی تاثرات کو دیکھ کر غالباً ایک ان کہی داستان پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے یوں ظاہر کر رہے ہیں گویا ایک دوسرے کو ڈرا بھی رہے ہیں اور اپنائیت کا احساس بھی دلا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی اپنے چہروں پر ابھرے تاثرات سے یقین دلا رہے ہیں کہ ہوٹل میں مکمل بکنگ (Booking) ہونے کی وجہ سے ایک ہی کمرے میں موجود ہیں ورنہ کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی نہ تو کوئی ارادہ ہے اور نہ کوئی منصوبے ہے۔

اچانک ایک جانے پہچانے چہرے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سبھی کی کیفیت یوں نمایاں طور پر اجاگر ہوئی تھی گویا پانچوں اشخاص کو امتحان ہال میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو! یہ شخص نہایت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا اور ایک صوفے پر بیٹھے ہی گویا ایک چھوٹے سے چشمے کے پانی میں گر کر یوں بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا گویا سمندر کی عمیق گہرائی میں ڈوبتے ڈوبتے اپنی جان بچا کر بڑبڑا رہا تھا۔

خدشات کے بوجھ سے دبے جسم کو

راحت دینے کی خاطر

ایک وقفے کے لئے سلا دیتا

اگر میرا اپنا گھر ہوتا!

اور پھر وہ نہ چاہتے ہی جب سو گیا تو پانچوں آدمی اطمینان کی سانس لے کر بھی میز پر رکھے وہسکی سے بھرے گلاسوں میں برف ڈال کر بھی اپنے تشنہ لبوں کو ٹھنڈک کا احساس نہیں دلا پا سکے!

اچانک فون کی گھنٹی نے صوفے پر گہری نیند سو رہے صحافی کو جگا دیا۔ چوں کہ فون اس کے قریب تھا اس لئے اُس نے نہایت ذمہ داری سے فون کا رسیور اٹھا کر نہایت ترش لہجے میں ایک سانس میں یہ کہہ کر فون کاٹ دیا کہ یہاں کرن کیسے ہو سکتی ہے!۔؟ فون رکھ کر اس نے اپنے موبائل فون پر کسی سے کہا کہ وہ ہوٹل کے فون پر تازہ ترین اطلاعات دینے کی بجائے ہر خبر کو ایک پردے کی جنبش سمجھ کر، اس کے ذاتی موبائل نمبر پر دے تا کہ خبران کی ہی چینل پر نشر ہو کر تہلکہ مچا دے اور چینل کی مقبولیت میں اضافہ کر پائے۔ صحافی کمرے میں موجود پانچوں آدمیوں کی مشکوک نگاہوں سے خوفزدہ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد کمرے میں موجود ایک بزرگ دل شکستہ ہو کر بول پڑا— فون کو کاٹ کر اجنبی نے اپنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

دوسرے نوجوان نے غصے سے ٹوک کر کہا بے ہودگی کہا جائے تو بہتر— کیوں کہ فون رام لیلا میدان میں ہو رہی ہڑتال کے بارے میں میری دوست نے میری بیوی کرن کے نام دی ہوگی۔

تیسرے درمیانی عمر کے سفید بالوں والے نے بطور جواز پوچھا۔ میں ایک وکیل ہوں۔ مقدمے جیتنے کی عادت برسوں سے پال رہا ہوں۔ پالتو کتوں کے بھونکنے کی آواز پہچان لینے کا عادی ہوں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کیا آپ کی وفادار ہے یا معاون؟

چوتھے آدمی نے گرج کر کہا— حساس معاملات میں قانونی نقطوں کو گھسیٹ کر جلوسوں، جلسوں یا عوامی تقریبات میں لانا عقلمندی نہیں ہے۔ پانچواں آدمی قہقہے لگا کر بزم میں ایک ایسی بات کہہ گیا جس کو سن کر سبھی نے ایک گھونٹ میں اپنے سامنے رکھے وہسکی کے

گلاس سے اپنا حلق تر کرنے والے کے دوسرے گلاس میں چھلک رہے جام سے جام ٹکرا کر اس کی اچانک خوشی کا راز کرید کر جاننا چاہا تو اس نے اپنی تجربہ کاری کا مظاہرہ کر کے اپنے موبائل پر آچکی ایک ایس ایم ایس اطلاع پڑھ کر سنانے سے پہلے اپنے مخصوص مسخرانہ انداز میں اپنے اردگرد بیٹھے چاروں اشخاص کو اطلاع دی کہ بھوک ہڑتال کرنے والے نے نہ اپنے جوشیلے بھاشن میں بیرونی ممالک کے بینکوں میں کروڑوں روپے جمع کرنے والوں کے نام بتا دیے اور نہ رقوم کی تفصیل بتا دی ہے۔اس لئے رات گئی بات گئی۔!

''وہ کیسے؟'' چاروں نے ایک ساتھ پوچھ لیا تو مسخرے نے ایک منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح سنجیدگی سے کہا—

''وہ ایسے کہ ایک وقفہ جو مل گیا—!

وقفے کے بعد کہانی بدل جاتی ہے۔ایک لمبے ٹیلی ویژن سیریل کی طرح۔!جس میں کردار بدل جاتے ہیں۔ایک وقفے کے بعد۔!جس میں موضوعات بدل جاتے ہیں۔ایک وقفے کے بعدے!۔!! بلکہ ایک وقفے کے بعد سیریل ہی بدل جاتا ہے۔! آخری وقفے کے بعد!سنجیدگی پر کامیڈی حاوی ہو جاتی ہے۔ایک وقفے کے بعد!

اور ہم سب مل کر ایک نیا سیریل بنائیں گے۔بشرطیکہ ہم سب ایک ہو کر سعی کریں۔! آخر ہم سب ایک ہیں۔!ہے نا؟

صحافی اپنے موبائل پر بات کر چکا تھا اور کمرے کے اندر پانچوں افراد کی خوشی دیکھ کر وہ حیران تھا کہ ایک وقفے کے بعد کیا سے کیا ہو گیا تھا۔!۔!!



سچ تو یہ ہے!

وہ ایک دور اندیش تحقیق کار اور انقلابی تخلیق کار ہے! ماضی کے آئینے میں اپنے حال کے عکس دیکھ کر، اکثر سانحات سے جڑے ڈراونے خدشات کی تحقیقی سمجھ اور بچاو کے امکانات کی تخلیقی سوچ دونوں سمٹ کر، فلمکار کی دلچسپی کو غور طلب تنقیدی تجسس میں بدل دیتے ہیں! صدیوں پہلے حکمرانوں کے، پتھروں پر کرید کر عیاں اور ان کے پسندیدہ مورخوں کی تحریروں سے بیاں تواریخ کی بجائے اپنے بزرگوں سے، صدیوں سے ایک نسل سے اگلی نسل کو اپنے آنکھوں دیکھے کانوں سنے، غم وخوشی کے تواریخی واقعات کو اہمیت دینے والا تحقیق کار اکثر یہ سوچنے کیلیئے مجبور کر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے تب ڈوب رہے اپنے وطن موہنجودھارا کو چھوڑ کر، ہجرت کرنے والوں کا کارواں اگر مشرق کی بجائے مغرب کی طرف چل پڑا ہوتا!؟ تو پھر آج انکے وطن کی جغرافیائی شناخت کیا ہوتی!؟ صدیوں پہلے اگر راجہ امبھی اور راجہ جے چند نے اپنے ہوس وحرص کی کی خاطر غیر ملکی حملہ آوروں کا ساتھ دے کر اپنے ہم وطنوں سے غداری نہ کی ہوتی!؟ تب آج وطن کی تواریخ وجغرافیہ کیا ہوتی؟ ایسے بیشتر سوالات کے جوابات میں پوشیدہ وطن کے خلاف ہو رہی سازشوں کو وطن پرست تحقیق کار یوں عیاں کرتا رہتا ہے گویا ایک رازداں، برف کی تہوں کے نیچے چھپائے گئے بارود کو عیاں کرتے ہوئے ہم وطنوں کو انکے اردگرد موجود عیار و مکّار نقاب پوش وطن کید شمنوں کی شناخت کرنے کا یقین دلا رہا ہو! سچ تو یہ ہے کہ دور اندیش تحقیق و تخلیق کار پیشے سے ایک فلمکار ہے! اپنے ہم وطنوں کی بے لوث خدمت کرنا اسکا جنونی شوق ہے! اور انکو ماضی کی سبق آموز زمینی حقیقت کو عیاں اور بیاں کی خاطر، ارادتاً و

مقصداً توریخی موضوعات پر فلمیں بنانے کا عادی ہو چکا ہے! یہ بھی سچ ہے کہ انقلابی تخلیق کار اپنے شوق کو ترجیح دیکر سنگین رات کے بعد ایک رنگین صبح کی تصوراتی عکاسی کرنے کی بجائے، اپنے ہم نوا ہم عصر ہم وطنوں کا صلاح کار بن جانے کی بجائے انکا خدمت گار و مدد گار بنکر انکی کشمکش زندگی میں شامل ہونے کا عادی ہو چکا ہے! تواریخی فلموں میں ماضی کی عبرت ناک زمینی حقیقت سے آشنا، اپنے ہم عصروں کی وقت کے ساتھ بدل رہی زندگی کی اہم ضروریات کو منطقی اہمیت دے کر، ذی ہوش خدمت گار انکو اپنائیت کی آڑ میں، اپنی عیاری اور مکّاری کا شکار بنانے والے، معاشرے میں موجود انکے اقتصادی و سماجی مسائل کو ارادتاً سیاسی اہمیت دے کر، غیروں کے اشاروں پر جمہوری نظام کو، عادتاً اکھاڑنے کے خود پرست شاطر خود ساختہ رہبروں کے پوشیدہ انتقامی منصوبوں کو بے نقاب کرنے کا عادی ہو چکا ہے! مگر اس بار، خدمت گار کے اذیت ناک تجربات کے حوالوں سے، بطور ایک فلمکار، اپنے بزرگوں کی آپ بیتی کی عکاسی کرنیکی بجائے، بیتے ہوئے 'کل' کی بجائے 'آج' ہو رہے، عالم میں چارسو پھیلے آدم خور کرونا وایرس سے جڑے ہم عصروں کے آنکھوں دیکھے کانوں سنئے سنسنی خیز واقعات اور دردناک حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے، آنے والے 'کل' کی اگلی نسلوں کی اطلاعات اور رہنمائی کی خاطر ایک نئی سبق آموز تواریخی فلم بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے!

سچ تو یہ ہے کہ فلمکار کرونا وایرس کے قہر سے دور رہنے کی خاطر احتیاتاً ماہروں طبیبوں اور حبیبوں کے مشوروں پر کئی مہینوں سے مجبوراً حفاظتی کرفیو اور لاک ڈاون کے دوران اپنے تخلیقی ساتھیوں اور فلم اسٹوڈیو سے دور ہو کر اپنے گھر میں تنہا رہنے کا عادی ہو چکا ہے! نتیجتاً اپنی سلامتی کی خاطر ایک دوسرے چار فٹ کی دوری رکھ کر، ماسک پہن کر، مسیحائی راحت کے منتظر اپنے پڑوسیوں رشتے داروں ناطیداروں اور اپنے کروڑوں ہم وطنوں سے الگ ہو چکا ہے! مگر 'فیس بک' پر مل رہی اطلاعات، ٹیلی وژن کی نشریات اور گوگل سے حاصل معلومات کے تعاون سے زمینی حقیقت سے آشنا اپنے ہم وطنوں کا خدمت گار انکی کشمکش زندگی سے جڑے رہنے کی خاطر، ان کے احساسات،، جذبات اور خیالات سے ارادتاً ہم آہنگ ہو کر ان کو اپنی رائے اور مشورے ٹویٹ کرنیکا عادی ہو چکا ہے! سچ تو یہ ہے کہ اس بار اپنی زیر غور فلم کا مسودہ تیار کرنے

والا تخلیق کار، تواریخی اوراق کے مطالوں کی بجائے گوگل کی معلومات کے عمیق مشاہدوں سے یہ جان چکا ہے کہ کررونا وائرس کے وجود کو خدوخال یا رنگ و بو کی مدد سے دکھایا نہیں جا سکتا ہے! مگر یہ سچ ہے کہ آدم خور کسی کو بھی چھو کر، اپنا شکار بنا کر، سانسوں کو دبوچ کر، جسمانی طور پر اذیتوں سے تڑپا تڑپا کر ابدی نیند سلا کر، خود اپنی شناخت کروا دیتا ہے! اور پھر قہرِ خدا کو بیاں کر دیتا ہے یا قہرِ آدم کو عیاں کر دیتا ہے؟ فلمکار اس متضاد سیاسی موضوع کی بجائے، فلمکار قہر پر قابو پانے والی مہرء آدم کو تواریخی اہمیت دیکر فخر سے اپنے عظیم سائنس دانوں کی تحقیقی سمجھ کی عمیق گہرایوں کو چھو کر تخلیقی سوچ کے آسمان کو پھاند کر، انکے ایجاد کیئے گئے مسیحائی ویکسین، کے شفائی کرشمات کو تخلیق کار اپنے تصور میں ابھرے منظر کو یوں عیاں کرنا چاہتا ہے گویا وہ اپنی زیرِ غور فلم میں، ناظرین کو گرداب میں پھنس چکی کشتی میں سوار لاچار مسافروں کو کراماتی ناخدا کی مسیحائی راحت کا یقین دلا رہا ہو! اور وہ کرونا وائیرس کے قہر سے ابھرے خدشات پر حاوی ہو کر مسیحائی راحت کے منتظر اپنے کروڑوں ہم وطنوں ک ویکسین لگا کر ماہروں کے احتیاتی مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ماسک پہن کئی مہینوں سے، پیدا ہوئے اقتصادی تدبیروں کے جمود کو توڑ کر ہم وطنوں کو کشمکش زندگی بحال کرتے دکھانے کا انتظار کر رہا ہو! مگر اس سے پہلے کہ سنگین راتیں کاٹ کر امیدوں کی رنگین سحر کا منتظر فلمکار اور ہم وطنوں کا مخلص خدمت گار اپنا احساسات کا پیغام ٹویٹ کر لیتا، ٹیلی وژن کی سبھی چینلوں پر واقعات کے حقیقی ویڈیو دیکھ کر وہ عوام کے انجام سے خوف ذدہ ہو کر یوں محسوس کر رہا ہے گویا مسیحائی ویکسین سے ابھری توقعات کی نئی صبح کو، مقصداً پھیلائی گئی دھند نے دبوچ کر شاطر وطن کے دشمنوں نے غافل ہم وطنوں کو، گھروں سے نکال کر انکو ہانک کر سڑکوں پر لا کر سنسنی خیز ہنگامے برپا کر دیئے ہوں! سچ تو یہ ہے کہ ٹیلیوژن کے چھوٹے اسکرین پر بڑے شہروں میں ہو رہے، سماجی سیاسی جلسوں جلوسوں اور طویل دھرنوں میں شامل ہو کر، کندھے سے کندھا ملا کر کبھی شفائی ویکسین اور کبھی آکسیجن، ایمبولنسوں اور ہسپتالوں کے بعد اب شمشانوں اور قبرستانوں کی مانگ کرنے والوں کے بیشتر ویڈیو دیکھ کر وہ فقط اسلیئے سکتے میں آ گیا ہے کیونکہ بے باک صحافت کے دعوی دار مدیر اور مبصر یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ لاک ڈاون کو توڑ کر اور آدم خور وائیرس کے پھیلاو کو روکنے کے تمام احتیات کو نظر انداز کرنے والے

خودکشی کرنے والے بوڑھے جوان بھیڑ بارڑ میں اتفاقاً غفلتاً یا ارادتاً شامل ہوتے رہتے ہیں؟ یا پھر انکو کوئی مقصداً مجبوراً یا پھر جبراً ہجوم میں شامل کیا جاتا ہے؟ مگر سچ تو یہ ہے کہ انکی مانگوں کی ترجمانی کرنیوالوں اور رہبری کرنے والوں کی تقریروں، تحریروں، بیانوں اور ضدی انتقامی ارادوں سے انکی شناخت ہوجاتی ہے! نتیجتاً ہم وطنوں کا مخلص خدمت گاران کو پہچان چکا ہے جو قہر کی لہر کو سیاسی رنگ دے کر پہلے ویکسین کے ایجاد کی مانگ کرتے رہے اور پھر ویکسین کے شفائی تاثرات پر اپنے شکوک سے ہم وطنوں کو گمراہ کرے کی سیاست کرتے رہے! جمہوری نظام میں آئینی حقوق کی آڑ میں انسانی رشتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے سرکار کے خلاف اپنی سازشوں کو نظریاتی اختلاف کے پیغامات سے عالم کی توجہ کا مرکز بنکر اس بار ویکسین کی قیمت، ویکسین لگوانے کی عمل اور ویکسین کی درآمد برآمد جیسے موضوعات کو اہمیت دیکر خود آدم خور مہاماری کو جنم دے کر، مقصداً لاشوں کی گنتی کرتے ہوئے ہم وطنوں کو مسیحائی راحت کا یقین دلا رہے ہیں! انکے متضاد گمراہ کن بیانات، اکسانے والے جذباتی تبصرے اور اشتعال انگیز تقریریں سن کر فلمکار مسیحائی راحت کی مہر آدم کو مقصداً انتقامی قہر آدم میں بدلنے والے خود پرست، خود رہبروں کے ارادوں کو بھانپ کر دور اندیش تحقیق کار نے اپنے ماضی کے تجربات اور خدمتگار نے اس دور کے خدشات اور تخلیق کار کی مستقبل کی قیاس آرائی نے فلمکار کو چونکا دیا! اگر اسکے حساس ہم عصروں نے اسکی زیر غور فلم دیکھ کر اس دور کے راجہ امبھی اور راجہ جے چند کو پہچان لیا تو کیا ہوگا؟ وطن کے غداروں کو بے نقاب کر کے ویکسین کی ایجاد سے جڑی مسیحائی توقعات سے ابھری خوشحالی کی امیدوں کو کیا اقتصادی تدبیروں میں بدل دیئے گئے؟ اگر گوگل کی تواریخی معلومات اور کمپیوٹر کی مشینی تدبیروں سے اپنی منطقی کشمکش زندگی کو ترتیب دینے والی اگلی نسل نے، گمراہ کرنے والے وطن دشمن رہبروں کو دیکھ کر بہک کر بھٹکنے کی بجائے بھڑک کر انکو ہٹا دینے کی بجائے انتقامی حقوق دینے والے جمہوری نظام کو ختم کر کے جمہوریت کے وجود کو ختم کر دیں تو وطن کا مستقبل کیا ہوگا؟! سچ تو یہ ہے کہ دور اندیش وطن پرست فلمکار کے خدشات جب انتباہ کی شکل اختیار کر کے کرونا وائرس کی طرح سانسوں کو دبوچنے لگے تب وہ ماسک پہن کر اور مہاماری سے بچاو کی خاطر احتیات اپنا کر خود کو اور اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے بچاو کیلئے فلم بنانے کا فیصلہ ترک کر دیا!



حقیقت

ملزم کے جواز سے متفق ہو کر منصف نے اسکو رہا کر دیا۔ مگر وہ اپنے حق اور مخالف نعرے لگانے والوں کے آپسی ٹکراؤ سے خوفزدہ ہو کر اپنے گھر میں چھپ گیا ہے۔

شام ہوئی تو ایک بے صدا دریچے سے جھانک کر دسہرے کے میدان میں راون، میگھناتھ اور کمبھ کرن کے استادہ پتلے بڑے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے اپنے بزرگوں کو یاد کرتا رہا، جن کو صدیوں سے تینوں کے متاثر کن پتلے بنانے مہارت حاصل تھی۔

وہ خوش ہے کہ اس کے ساتھیوں نے اسکی گرفتاری کے بعد بھی رات بھر لگن سے راون کے مسخ ذدہ چہرے کو اپنی کاریگری سے سہی رنگ روپ میں لایا تھا۔ اور اب وہ تینوں پتلوں کو شعلوں کا کفن اوڑھ کر راکھ ہوتے ہوئے دیکھ کر اطمینان سے سو جانا چاہتا تھا۔ مگر میڈیا کے دباو کی وجہ سے اپنی خود سنائی کہانی سنتا رہا!

گئی رات وہ ٹی وی پر مبصرین کی مقامی دسہرہ میں جلائے گئے پتلوں کے حوالوں سے جڑی بحث سنتا رہا! سبھی اس کو تشدّد پسند یا فرقہ پسند کی تختی پہنانے، یا امن پسند، تاریکی پسند سیکیولر توانائی سے جوڑنے کی ضد پر قائم تھے۔ پھر جب اسکے بیان نے سبھی شرکا کو چونکا دیا تھا! صحافی سچّائی کا ترجمان ثابت ہوا تھا! نتیجتاً اس نے جو بھی کہا تھا وہی ٹی وی پر سنتا رہا۔

''راون، اسکے بھائی اور بیٹے کے پتلے بنانے کا فن ہمارے خاندان کو ورثے میں ملا ہے۔ میں راون کی آنکھوں میں غرور کا تاثر لانے کی کوشش کر رہا تھا جب چندلڑکے راون کے لئے نفرت عیاں کرتے ہوئے میری تخلیق کو مسخ کر گئے۔ میں نے روکا تو انہوں نے سختی سے ٹوکا۔

ہنگامہ برپا ہوا تو مجھے گرفتار کیا گیا۔ میری نہ کسی سیاسی جماعت سے ہم آہنگی ہے اور نہ کسی تنظیم سے وابستگی ہے۔ بلکہ کسی کی مدد کا طلبگار بھی نہیں ہوں۔ جو بھی سچّائی جان لینا چاہتے ہیں وہ یہ جان لیں کہ یہی سچ ہے۔۔۔''

یہ سنا کر وہ ٹی وی بند کر کے لبوں کو سی کر دیوار پر آویزاں دادا جی کی گھڑی کی ٹک ٹک اسی طرح سنتا رہا جیسے بلیک آوٹ یا کرفیو میں سنا کرتا تھا۔



سودا!

میں اور میرے ہم نوا پیشہ ور اداکار ہیں سر جی! اسٹیج پر، جلسوں میں اور سڑکوں پر، کہیں بھی اپنے سر پر تاج رکھ کر، مخصوص ٹوپی یا گنجے کی وگ پہن کر، حسبِ ضرورت پوشاک میں کبھی مہاراجہ چندر گپت موریہ کبھی سلیوکس اور کبھی چانکیہ پنڈت کے تواریخی کرداروں کی نمائش کرنے میں ماہر ہیں! سیاسی جماعتوں کے پرزور اصرار پر اپنی شرطیہ کامیابی کیلیئے ہم نے اپنے پاس مختلف سیاسی جماعتوں کی شناختی ٹوپیاں، انکے لیڈروں کے چہروں کے ماسک کے علاوہ گیس سلنڈروں کے کٹ اوٹ بھی مظاہروں کیلیئے بنا کر رکھے ہیں! اسلیئے اوروں سے زیادہ مہنگے ہیں! سودا قبول ہو تو آپ کے جلسوں جلوسوں میں آپ کی ٹوپیاں پہن کر شامل ہونے کی تیاری کرلیں!؟



انجام۔۔!

میں سمندر کی اس پراسرار خاموشی کی بات نہیں کر رہا ہوں، جو ایک آنے والے طوفان کی اطلاع دیتی ہے! میں ہروشما اور ناگاساکی کے اکھڑ چکے وجود کی عبرت ناک خاموشی کے حوالے سے قہر آدم کی اطلاعات نہیں دینا چاہتا ہوں! میں سرحد پر جنگی طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور سایئرن کی گونج سن لینے کے باوجود اجڑ کے گاوں کی خاموشی کو جیت کا عنوان نہیں دے سکتا ہوں! کرونا وایئرس کے قہر کو شمشانوں اور قبرستانوں کی المناک خاموشی سے بیان نہیں کر پاوں گا! مگر کرونا وایئرس کی دوسری لہر سے ابھری مہاماری کے قہرء آدم سے بچاو کی حفاظتی احتیات کو نظرانداز کرنے والوں دھرنوں میں شامل بھیڑ کی اشتعال انگیز نعروں اور ٹریکٹروں کی گڑگڑاہٹ کا شور اور گمراہ ہو چکے ہم وطنوں کی رہبری کرنے والے ان کے خودساختہ محافظ اور اشرف المخلوق ہونے کے دعویداروں کی مشکوک خاموشی کے حوالے سے ایک بہت بڑے طوفان کی اطلاع دے کر انکے عبرت ناک انجام سے خوفزدہ ہو چکا ہوں!



خاموشی!

انجلی بھارتی ایک پیشور تجربہ کار 24 گھنٹے تیمارداری کرنے والی ایک نرس ہے اور ڈاکٹر کیشو شرما امریکہ کا مستقل باشندہ، ایک نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرنے میں ماہر ڈاکٹر ہے۔ تین مہینے پہلے جب دونوں پردیس میں اپنے شوہر کی موت کے صدمے سے سکتے میں آ چکی دیوکی سے ملے تھے تب اپنے جسمانی درد سے زیادہ اپنے ذہنی انتشار سے تڑپ رہی اپنی ماں کو اسکے ضدّی اثرار پر ڈاکٹر کیشو اسکو اپنے گھر میں لایا تھا!

اپنی ماں کے زندہ جسم میں مردہ اظہارات سے آشنا بیٹے کو یقین تھا کہ لاچار مریضہ کی خاموشی طوفان سے ٹوٹ جانے والی سمندر کی ڈراونی خاموشی نہیں ہے۔ بلکہ سحر کی سہانے اجالے سے ٹوٹ جانے والی رات کی بھیانک، معنی خیز و غور طلب خاموشی ہے۔ اور یہ جواز دیکر فکر مند بیٹا اپنی ماں کی دیکھ بال کرنے کیلیے انجلی کی رضامندی حاصل کر کے، دیوکی کو اسکے سپرد کر کے امریکہ چلا گیا۔

مگر جانے سے پہلے وہ ماں کے آرام دیہہ بسر کیلیے انجلی کو ایک موٹی رقم دے گیا تھا۔ گم سم ماں کو اپنایت کا ساتھ دینے کی خاطر اپنے رشتہ داروں کو ہوایی جہاز کی ٹکٹیں بھیج چکا تھا۔ فلیٹ کی اسٹور روم میں سال بھر کے کھانے پینے و دیگر ضروریات زندگی سے جڑی اشیا رکھ گیا تھا۔ سال بھر کی تنخواہ پیشگی دیکر کھانا بنانے والی، کپڑے دھونے والی، گھر کی صفایی کرنے والی اور مالش کے بعد مریضہ کو نہلا دینے والی کو ملازم رکھ کر گیا تھا۔

اور تب سے اب تک وہ روز موبایل پر ویڈیو کالز دیکر اپنی ماں کو دیکھکر اور انجلی سے

ہمکلام ہوکر تازہ ترین حالات کے بارے میں جانکاری رکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ماں کے تھرتھرارہے ہونٹ دیکھ کر اکثر جذبات کی رو میں بہ کر دیو کی خاطر اسکو اپنی داستان حیات سنانے کا یوں عادی ہو چکا تھا گویا مسیحا سے مخاطب ہو کر منتروں کا جاپ کرتے ہوئے ماں کی شفا کے لیے دعا کر رہا ہو۔

ماضی کی یادوں کو بار بار تازہ کرتے ہوئے دلچسپی سے کیشو کی آپ بیتی سن چکی انجلی یہ جان چکی ہے کہ دیو کی ایک مندر کے پجاری کی ان پڑھ مگر اپنی صدیوں پرانی روایت کی عمل سے آشنا بارہ برس کی بیٹی تھی۔ اور اسکی شادی صدیوں پرانے فلسفوں اور استعاری ردایت کے ترجمان ایک عقیدت مند پیشور پروہت کے بیٹے سے ہوئی تھی۔

واسودیو تب سولہہ برس کا تھا۔ اپنی انقلابی کشمکش زندگی میں الجھا تب گاوں کے اسکول کو چھوڑ کر شہر میں سرکاری افسروں کے گھروں میں چھوٹے بڑے کام کرتے، خود پڑتے، اپنے ہم عمر ہم جماعتی امیرزادوں کے ہوم ورک کرتے کرتے اور پڑھاتے پچھلے پچاس برسوں کے دوراں اپنے گاوں کے پرایمری اسکول سے یونیورسٹی تک پہنچنے کی خاطر ایک عزاب دہ اقتصادی بہران کا ڈٹ کر مقابلہ کر چکا ہے۔

اپنے ذاتی تجربات کے ضدّی حوالوں سے اپنے والد کے فلسفوں سچڑے پچھلے جنم اور اگلے جنم کے درمیاں لٹک رہی تقدیر کے کرشمات اور سانحات کے اعتقاد کو خارج کرتے ہوئے اپنے اعتماد سے اپنی انقلابی تدبیروں سے ابھرے کارناموں کا ڈنکا بجانے والا ہم خیال انقلابیوں کا ہم سفر بن گیا۔

مقامی یونیورسٹی میں اقتصادیات سے جڑے شعبے کے سربراہ اور ایک انقلابی تحریک سے جڑی ہم خیال ملازموں اور طلبا کی انجمنوں کے مشیر پروفیسر واسودیو انقلابی نے ارادتاً دیو کی کے اعتقاد کو دبوچکر اسکو اپنی خاموشی سے اپنے شوہر کی ہر بات کی تصدیق کرنا سکھا دیا۔ نیتجتاً واسودیو کے اعتماد کی انقلابی نوک سے اعتقاد کو بلا کریدنے کی انتقامی سیاست کی تصدیق کرنے والی بیوی اپنے عقیدت مند پڑوسیوں اور رشتے داروں سے الگ تھلگ ہوکر رہ گیی۔ بلکہ اپنے دادا کے قول اور اعمال کو اپنا کر اپنے عقیدت سے جڑی بیشتر روایات پر عمل کرنے والا اکلوتا بیٹا

کیشو بھی ماں باپ سے الگ ہوکر دس برس سے امریکا کا مستقل باشندہ بن گیا۔

اپنے ہوس وحرس کی خاطر عالم کی اقتصادی بحران کا شکار بنانے میں امریکا کی حکومت کا ساتھ دینے، بھارتیوں سے نفرت کرنے والا، ایک غریب پرور ہونے کا دعوا کرنے والا واسودیو جب بیوی کو ساتھ لیکر امریکا میں اپنے بیٹے کے گھر میں داخل ہوا تب دیوکی یہ سمجھ نہیں پایی تھی کہ یہ دلکش واقع واسودیو کی منطقی تدبیر سے ابھرا کرشمہ ہے یا کیشو کے اعتقاد سے جڑا کارنامہ!

وہ خوش تھی کہ اسکی خاموشی من چاہے عمل کی تصدیق کر رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ سال کی پہلی برف باری کے بعد وہ اپنے شوہر کا ہاتھ تھام کر اپنے بیٹے کے قرب سے بھی لطف اندوز ہوکر دونوں کے قدموں سے قدم ملاکر برف کی چادر پر چل رہی تھی۔ اور یوں محسوس کر رہی تھی جیسے دس برس کی دوریاں نزدیکیوں میں بدل رہی تھیں۔ مگر واسودیو نہ جانے کیا سوچکر بار بار رک کر اور پلٹ کر اپنے ساتھ دیوکی کے بھی قدم روک کر ہر بار پلٹ کر برف کی چادر پر اپنے قدموں کے نشان دیکھ کر غالباً گن رہا تھا یا پھر اپنے ماضی کے عکس دیکھ رہا تھا۔

اچانک چند قدم چل کر اس بار جب اسنے رک کر اور پھر پلٹ کر دیکھا تب دیوکی کا ہاتھ چھوڑ کر وہ گر پڑا۔ تب کیشو نے جب اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تھا تب تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ تب اپنے باپ کی بجھی آنکھوں کو دیکھکر تھرتھرا رہے کیشو کو لگا جیسے مرحوم دادا اسکو تسلیاں دیکر رنج کو سہنے کا حوصلہ دیتے ہویے زندگی کی وہ سچایی عیاں کر رہا ہو جسکو کویی ایجادی عمل غلط ثابت نہیں کر پایی ہیں۔ اور وہ اپنی ماں کو یہ سمجھاتا رہا کہ ہر جاندار کی زندگی کا سفر جنم سے شروع ہوتا ہے اور اسکی موت کی ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر کون کب کہاں اور کس وقت پیدا ہوتا ہے، کب کہاں اور کس وقت مرجاتا ہے یہ کویی نہیں جان پایا ہے۔ اس بار دیوکی نے اپنی خاموشی سے کیشو کے قول اور عمل کی تصدیق کی تھی۔

مگر اگلے دن پردیس میں اپنوں کی کمی محسوس کرتے ہویے روایات کی عمل کے بغیر جب اسنے ارتھی کے متبرک شعلوں کی بجایے اپنے شوہر کے جسم کو بند کمرے میں برقی کے جھٹکے سے راکھ میں بدلتے دیکھکر آشفتہ دل سے اٹھی ہوک دماغ پر دستک دیکر ایک دردناک چیخ بن

گیی تھی۔ فرمابردار بیٹا ماں کو اپنے گھر لے آیا تھا مگر ماں کی سنسنی خیز خاموشی کی وجہ سے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے باپ کی روح کو سکون دلانے کی خاطر دسویں دن سے تیرہویں دن کے روایتی شرادھ کر نہیں پایا تھا۔ بے بس ہو کر اسکی خاموشی کے ٹوٹ جانے کا منتظر روز ماں کے تھرتھرا رہے ہونٹ دیکھکر اپنے ہونٹ سی کر ویڈیو کال بند کرتا ہے۔ مگر سلسلہ ویسے ہی جاری ہے جیسے کیشو نے سوچا ہے۔

پچھلے تین مہینوں کے دوران گھر کے ملازم باقاعدگی سے ویسے ہی کام کرتے رہے ہیں جیسے کیشو نے سمجھایا تھا۔ روز الاصبح آکر گیی شام جاتے رہے۔ انجلی تن من اور دھن سے دیوکی کی دیکھ بال کرتے ہوئے سحر سے شام تک ہی نہیں بلکہ رات کے کسی پہر بھی وہیل چیئر پر بیٹھی کرب اور کراہاں سے تڑپ رہی مریظہ سے سوالات کرتے ہوئے اسکی خاموشی توڑنے کو اپنی ہر ممکن کوشش کرتی رہی۔ ہاں مگر کیشو کی توقعات کے خلاف اسکے مرحوم باپ کے قول اور اعمال سے نفرت کرنے والے رشتے داروں نے اسکی حمایتی بیوی کے نزدیک آنے کی پہل نہیں کی۔ اور پسند کرنے والے ہم خیال عوام کی اقتصادی بہران کی ترجمانی کا دعوا کرنے والے دوستوں نے دیوکی کی خاموشی کے حوالے دیکرانجلی کی تیمارداری کو ایک انقلابی خاتون کو قیدی بنانے کی فرقہ پسندوں کی سازش کا نام دیکر اپنے سیاسی جلسوں میں اسکو توجہ کا مرکز بنا کر 'مدر انڈیا' کا لقب سے نواز کر اسکی آزادی کے ساتھ واسودیو کے فلیٹ میں اپنا دفتر بنانیکی مانگ کرتے رہے۔۔۔ پیغامات دیتے رہے۔ انجلی اور کیشو دونوں اپنے خلاف ہو رہے اشتیال انگیز مظاہروں کو نظرانداز کرتے رہے۔

مگر تب جب اپنی کشمکش زندگی میں اپنے اعتقاد سے جڑی قدیم روایات کے کرشمات پر بھروسہ کرنے والے اور اپنے اعتماد سے ابھرے انقلابی تدبیروں کے کارناموں پر یقین کرنے والے کروڑوں ہم وطنوں نے ایک مسیحایی پیغام سن کر، ایک ہو کر ''کرونا وایرس'' کے وبایی پھیلاو کو روکنے کے لیے جو انوکھی جنگ چھیڑ دی، انجلی بھی اپنے کوڑوں ہم وطنوں کی طرح اپنے آپ کو ارادتاً دوسروں سے الگ تھلگ رکھ کر خود کو اور دوسروں کو وبا سے بچانے کی جنگ میں شامل ہو گئی۔ گھر میں کام کرنے والے سبھی ملازموں کو پہلے دن سے سوسایٹی والوں نے روکا تھا یا وہ خود

امریکا سے لوٹ کر آیی دیوکی سے خوفزدہ تھے یہ جان لینے کی کوشش کیے بغیر سنگین راتیں کاٹ کاٹ کر رنگین سحر کی منتظر انجلی اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرح اپنے گھر میں ارادتاً" دن رات رہکر دوسرے کے گھروں سے دوریاں رکھ کر ایک فیصلہ کن اکیس دن کی جنگ میں شامل رہی۔

اور آج بیس دن کے اختتام پر اپنے مسیحایی رہبر کا پیغام سن کر انجلی بھی رات کے 9 بجے مقصداً تمام بتیاں بجھا کر اپنے فلیٹ میں پھیلے اندھیرے کو سوسایٹی میں چارسو اندھیرے سے جوڑ کر اپنی معنی خیز نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر سوسایٹی میں رہنے والوں نے جب برامدوں میں ارادتاً چراغ جلا کر مقصداً تالیاں اور گھنٹیاں بجا کر اجالوں کا خیر مقدم کیا تب دیوکی اپنی وہیل چیر چھوڑ کر ایک گیند کی طرح اچھل کر برامدے میں داخل ہویی اور اپنے تھرتھرا رہے ہونٹوں پر لگی مہر خاموشی توڑ کر انجلی کے موبایل پر نظر آرہے کیشو سے مخاطب ہو کر بول پڑی ''جب میرے باپو اس دنیا کے اجالوں کو چھوڑ کر دوسری دنیا کے اندھیروں میں کھو گیے تب میری ماں روز شام ہوتے ہی ایک دیا جلا کر دہلیز پر رکھ لیا کرتی تھی۔ تمہارے پاپا بھی اندھیروں میں کھو چکے ہونگے۔ تم بھی اپنی دہلیز پر ایک چراغ رکھ دو اور 'لو' کو دیکھ کر گھنٹی بجاتے رہو۔ اس جہان کا مالک انکی مدد کرتا ہے جو اعتقاد یا اعتماد سے خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ یہ تمہارے داداجی کہا کرتے تھے''۔

دیوکی کی باتوں کے ساتھ گھنٹیوں کی گونج سن کر اپنے اردگرد چارسو پھیلے اجالوں میں انجلی، ڈاکٹر کیشو اور اپنی انوکھی جنگ جاری رکھنے والے کروڑوں ہم وطنوں کی فتح کے عکس نظر آرہے ہیں!



تلاش۔۔۔!

ابھی بہت اندھیرا ہے! اور میرے پوتے نے مجھے جگا کر جنم دن کی مبارک دی ہے۔ پھر میری گود میں لیپ ٹاپ رکھ کر میرے شانوں سے چپک کر وہ میری دلچسپیوں میں شامل ہو گیا ہے۔! خوش ہوں کہ کورونا وائرس کی بندش سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود آج میں فیس بک کے کرشمات سے اپنے پڑوسیوں سے تو کیا اپنے ملک اور بیرونی ممالک میں آباد شناسا اپنوں اور غیر شناسا اجنبیوں سے ملنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ مبارکبادی کے پیغامات سن کر، پڑھ کر اور ویڈیو دیکھ کر میں انکی شادمانی کو اظہارات میں اپنایت کیسہانے کرب کو محسوس کر رہا ہوں۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ تیس برس پہلے، میری ہی طرح اپنے گھر سے اکھڑ چکے ہم عصروں نے روبرو ہو کر مجھے اپنے آبائی وطن سے جوڑ دیا ہے۔ کشیپ رشی کے کشمیر میں صدیوں سے آباد موروثی بسکین سے جڑی میری یادیں تازہ کر دی ہیں۔

1990 میں ہجرت کے بعد بھارت، امریکا اور آسٹریلیا کے مختلف شہروں میں چین سے زندگی گزارنے والا کوئی میرے اسکول اور کالیج کی یادیں تازہ کر چکا ہے تو کوئی محلے میں اکثر مچھلیاں بیچنے والی، دریا کنارے رسد دینے والے بہت بڑی ناو کا ذکر چکا ہے۔ کوئی ہمارے محلے کے بازار میں اپنائیت کا احساس دلانے والے سبزی، گوشت اور دودھ فروش کی نقلیں اتارنے والے نائی کی یاد دلا چکا ہے۔ کوئی ساتھ کام کرنے والے افسروں و ملازموں کے حوالوں سینیکی اور بدی کے کھٹے میٹھے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے چھوٹی بڑی ان خوشیوں کا احساس دلا دیا ہے جو اب عالیشان جدید بستیوں میں رہ کر نہیں مل پاتی ہیں۔ نتیجا" اپنے سبھی دوستوں کی

خواہشات سے ہم آہنگ ہوکر دل چاہتا ہے کہ جہاں میں نے اپنی اسّی برس کی عمر میں پچاس سال بسر کیئے ہیں وہیں زندگی کی شام ہوجائے۔

خوش ہوں کہ میری دلچسپی سے متاثر ہوکر میرا پوتا میرے شانوں سے چپک کر فیس بک پر آرہے میرے دوستوں کے پیغامات پڑھتا رہتا اور ویڈیو دیکھتا رہتا ہے اور لڑکپن کے تجسّس کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ میرے 60۔80 کی عمر کے دوستوں کے سبھی پیغامات دیکھ رہا ہے۔ انگریزی میں لکھے جملے وہ خود پڑھ لیتا ہے جبکہ اردو میں بھیجے گیے پیغامات میں پڑھ کر اسکو سناتا ہوں۔

جب کسی ویڈیو میں کوئی نیا/ پرانا کشمیری نغمہ بجتا ہے تب وہ میرے ساتھ گنگنا کر اپنے کشمیری ہونے کے فخر کو عیاں کرتا ہے اور میری دلچسپی سے ہم آہنگ ہوکر بیشتر پیغامات کو اپنے تجسّس کا مرکز بنالیتا ہے۔ اسکی یہ کیفیت بھانپ کر میں اسکو صدیوں پرانی کشمیری روایات کی جانکاری دینے کی خاطر مقامی حکایتیں سنا دیتا ہوں۔ میری صلاحیتوں پر بیشتر دوستوں کے قصیدے سنکر اسکا پیار امنڈ کر ایک عمدہ جنونی اظہار بن جاتا ہے۔ مگر مجھے 'کشمیر کا گوگل' کا لقب دینے والا، میرے شانوں سے چپک کر، میری گود میں رکھے لیپ ٹاپ پر اپنی نگاہیں جمی رکھنے والا میرے بچپن سے جگری دوست خالد کے ویڈیو کو دیکھ کر وہ اچانک چونک پڑا ہے۔ اور میں اپنی پسند پر حیران ہونے والے پوتے کو یہ سمجھا نہیں پارہا ہوں کہ میرا ہمدرد یار مجھے گویا صحرا میں چلتے چلتے کوئی نخلستان دکھا کر ہم دونوں پر کرم کر رہا ہے۔ یا سراب دکھا کر ستم کی اطلاح دے رہا ہے۔

اسکی سراسیمگی کے اظہار کو نظر انداز کرتے ہوئے جو ویڈیو بار بار دیکھ رہا ہوں وہ خالد نے مجھے میرے جنم دن پر خاص طور پر بھیجا ہے۔ خالد اور میں ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔

خالد کا ویڈیو ایک مختصر دستاویزی فلم ہے۔ آغاز میں دریا کنارے ایک قدیم شومندر سے جڑا وہ گنجان محلّہ یاد آتا ہے جہاں میرا ہم عمر دوست خالد میرا پڑوسی تھا۔ آغاز میں ایک لمبے کوچے کے دونوں طرف مکانوں کی نمائیش سے ہمارے گنجان محلے کی شناخت کی گئی ہے جہاں خالد تیس برس پہلے شناسا ہندوؤں کے ساتھ رہنے والا واحد مسلمان تھا۔ تب وہ میرا ہم نفس نیک پڑوسی ہوا کرتا تھا۔ ویڈیو میں شامل مسلمانوں کے گنجان گاؤں کی نمائش کی گئی ہے۔ وہاں موجود

بہت بڑا ہندوؤں کا واحد مکان تیس برس پہلے میرے مرحوم نانا کا گھر ہوا کرتا تھا۔

آخر میں بیشتر اردو، انگریزی اور کشمیری اخباروں کے تراشوں کا ایک غور طلب کولاج ہے۔اور اس سنسنی خیز خبر کی اطلاع دے رہا ہے''1990 میں دہشت گردی کی بربریت سے اپنے موروثی گھروں سے اکھڑے لاکھوں کشمیری پنڈتوں کی گھر واپسی! مرکزی سرکار کا اعلان۔۔!!''

کولاج کی نمائیش کے بعد خالد کی آواز ابھر کر سنائی دے رہی ہے۔

''اوتار میرے یار! خوش ہوں کہ ہم تیس برس بعد اپنے یوم پیدائش پر مل پائے!۔ کہاں ہو۔۔۔؟۔۔۔نوئیڈا میں یا نیویارک میں۔۔؟ بغلگیر ہونے کو جی چاہتا ہے! اپنے وطن کی یاد آرہی ہے تو لوٹ کر آجاؤ۔ ساتھ رہکر اپنا بڑھاپا گزارین! مگر رہیں گے کہاں۔۔؟ تمہارا صدیوں پرانا گھر ایک بک چکا مکان ہے اور گنجان گاؤں میں تمہارے نانا کا گھر ایک مہاجر کا ویران مکان ہے۔۔۔!

تمہارا اپنا ہوں اس لیے تصویریں بھیج کر زمینی حقیقت عیاں و بیاں کر رہا ہوں۔تم بتادو کہ اخباروں کی سرخیوں میں صداقت کی مٹھاس ہے یا سیاست کی کڑواہٹ۔۔۔؟ جواب کا منتظر۔۔۔!''

پچاس برس ساتھ ساتھ گزارے دنوں کی یادیں اکثر تنہائیوں کا احساس دلا رہی ہیں۔ شہر اور گاؤں کی یہ تصویریں حقیقت کو عیاں و بیاں کر رہی ہیں۔گھر واپسی کے بارے میں اخباروں کی سرخیاں دیکھ کر جان نہیں پاتا کہ اطلاعات میں صداقت کی مٹھاس ہے یا سیاست کی کھٹاس۔؟

اب شام ہو چکی ہے۔اور میں دن بھر بار بار لیپ ٹاپ کھول کر دیش بدیش سے آچکے شناسا اپنوں اور غیر شناسا اجنبی فیس بک کے سبھی دوستوں کے پوسٹ کئے پیغامات پڑھتا رہا اور ویڈیو دیکھتا رہا۔مگر خالد کا ویڈیو دیکھ کر میری کھوج سکتے میں آجاتی ہے۔میرا پوتا میری دلچسپی سے اوبھ کر کب کا چلا گیا ہے۔مگر میں شہر میں اپنے پشتینی مکان اور گاؤں میں اپنے نانا کے قدیم مکان کو کھوجتی نگاہوں سے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا ہوں۔ایک بک چکا مکان ہے اور دوسرا ایک ویران مکان ہے! اور میں دونوں میں ماضی کے عکس دیکھ کر اپنے کھو چکے وجود کو تلاش کر رہا ہوں۔!!!



کہیں یہ وہ تو نہیں!؟

دہشت کے قہر سیا کھڑ چکے موروثی بسکین کی بربادی کا چشم دید گواہ اپنی حقیقت سے آشنا ہے! صدیوں پرانی روایات پر عمل کرتے ہوئے، اپنوں کو جگ بیتی و آپ بیتی سنانا اسکا موروثی پیشہ ہے اور جنونی شوق بھی! بھری بزم میں، اپنے بزرگوں کی خود سنی سناء، سبق آموز اسطعاری حکایتیں، گلستان بوستان کی دلچسپ صدیوں پرانی کہانیاں کو گا کر سنانے کا وہ عادی ہے! صدیوں سے، ہر دور میں انکے چشم دید، ماضی سے جڑے سکھ دکھ کے حقیقی واقعات کو اپنے آنکھوں دیکھے کانوں سنے سانحات سے جوڑ کر، باقاعدگی سے بیان کرتے ہوئے وہ زمینی تواریخی حقایق کو عیاں کرنے والا ایک فرض شناس داستان گو ہے! اور یوں حکمرانوں و مورخوں کیا رادتاً چھپائے جبرّ وتشدّد کے سانحات کو عیاں کرنے کی ذمہ داری کو نبھانے کا عادی داستان گو اس بار ایک لاچار یرغمال ہے! اور وہ ویراں مکان کے خودساختہ ناظم کی انتقامی تدبیروں سے جڑے شاطر ارادوں سے آشنا ہے! وہ جانتا ہے کہ مقصداً مکان کو اجاڑ کر، موروثی مکین کو مار کر یا بھگا کر انکے پاسباں کو مطلباً دربان بنانا اور بوقت ضرورت اسکو غیر موجود مکین کا ترجمان ہونے کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہو یا سکو میزبان کا وقتی درجہ دینا ایک بین القوامی سازش ہے! وہ یہ جانتا ہے کہ اسکا برباد ہو چکا گھر نہ ایک عجاعب گھر ہے اور نہ اپنی بربادی کی داستان عیاں کر دینے والا ایک کھنڈر ہے! بلکہ ناظم کی ارادتاً سجائے گئے ایک ایسی سیاسی مالش گاہ ہے جو فقط چکا چوند روشنیوں میں نظر آتی ہے! اور وہ برسوں سے، انتقامی آقا کی ہدایات پر انقلابی موروثی بسکین کی غیر موجودگی میں مجبوراً ایک میزبان بن جاتا ہے! پھر اپنے لب سی کر، آنسو پونچھتے پونچھتے، عام

تماشہ بین کی آڑ میں فقط ناظم کے چنندیدہ مورخوں، مفکروں، دانشوروں اور صحافیوں کی پزیرائی کرتا رہتا ہے! اور اپنے مذہب پرست، امن پسند ہم وطنوں کے ماضی سے جڑی، اپنی تواریخی معلومات کا بوجھ اٹھانے والے کو مہمانوں کے عالمی بحث مباحثوں میں لازماً شامل کیا جاتا ہے! اسکی موجودگی میں ہم خیال شرکا اپنی عالمی اطلاعات ونشریات میں وہ اپنوں کی زمینی حقیقت کو مقصداً اپنی بناوٹ کے سانچوں میں ڈال دینے کے عادی ہو چکے ہیں! اور پھر جب مذہب کے رنگوں سے سجا کر وہ ماضی کے حملوں سے جڑے سانحات اور اپنی جدید انتقامی تدبیروں کو انقلابی کارناموں کا نام دے کر، داستان گو کی موجودگی کو عوام کی ترجمانی اور اسکی خاموشی سے اپنے گمراہ کرانے میں اپنی عیاری و مکاری میں مہارت حاصل کر چکے ہیں! مگر اجنبیوں کی زبانی اکھڑ کر بچھڑ چکے ہم وطنوں مہاجروں کی داستان سن کر وہ لرز اٹھتا ہے! مگر صوفی سنتوں کے اصولوں پر عقیدتاً عمل کرنے والا لاچار داستان گو اپنی شمولیت کی عالمی سنسنی خیز اہمیت سے آشنا ہے! مگر چاہتے ہوئے بھی نہ وہ انکو ٹوک پاتا ہے اور نہ انکے گمراہ کن عالمی پیغامات کو روک سکتا ہے! نتیجتاً سچ پر وقت کے آمروں کے ہوس وحرص کے ارادتاً لگائے گرہن کو اپنی موجودگی سے جوڑ کر وہ اپنے وجود سے خوفزدہ ہوتا رہتا ہے! اور ذہنی طور پر تذبذب کے دلدل میں دھنس کر چہروں کے ہجوم میں شناسا ہم وطنوں کا متلاشی نا امید ہوکر بار بار رو پڑتا ہے! مگر ہر بار عیار اور مکّار خو ساختہ خیر خواہ اسکے کرب و کراہن کی کیفیت کو مسّرت سے جوڑے، خوشی کے آنسوں کا نام دیکر عالمی توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے! اور اپنے آزمودہ حکمت عملی سے اسکی داستان کو بدل کر اپنے ہم خیال مورخوں سے قلمبند کرنے عادی ہو چکا ہے!

مگر جب اطلاعت اور نشریات کی چکا چوند روشنیاں بجھای جاتی ہیں تب نمائش گاہ ایک ویران مکان بن جاتا ہے! اور سنگین راتیں گزار کر رنگین صبح کا منتظر داستان گو، غیروں اور اجنبیوں سے الگ ہوکر تنہایوں میں اکثر ویراں دہلیز پر ایک چراغ رکھ دیتا ہے! اور پھر تاریکیوں کو چیرتی ؤمیں اپنے ماضی کے عکس دیکھ کر اپنے وجود سے محبت کرنے کا عادی ہو چکا ہے! اور وہ اپنے بزرگوں سے سنے ماضی کے ملتے جلتے واقعات کو یاد کرتے ہوے وہ مستقبل سے جڑے ایک سہانے انقلابی تجّسس میں کھو جاتا ہے!

اسکو یقین ہے کہ تواریخ اپنے آپ کو دہرائے گی! اور اپنوں سے محبّت اور غیروں سے نفرت کی بجائے عالمی امن کی خاطر ان سید وستی کا ہاتھ بڑھانیوالے، صوفی سنتوں کے آزمودہ اصولوں کو اپنانے والا اشرف المخلوق، چارسو پھیلی دہشت کی تپش کو اپنی مسیحائی اپنایت کی سہانی آنچ میں بدل کر اسکے ویراں گھر کو آباد کردے گا! اکھڑ کر بچھڑ چکے اپنوں کی بربادی کے چشم دید واقعات عالم کو سنا کر پھر سے داستان گوئی کا قدیم سلسلہ جاری کر پایگا!

اور وہ پچھلے تیس برس سے خاموشی کو چیرتی ہوئی آہٹ سن کر جھوم اٹھتا ہے!۔۔۔

کہیں یہ وہ تو نہیں!؟



مگر کب؟!

بڑے میاں ،مقامی یونیورسٹی میں طلبا کو جغرافیہ پڑھایا کرتے تھے! ملازمت کے دوران موقعہ ملتے ہی لایبریری میں تواریخی کتابوں کا تحقیقی مطالہ کرنا انکا ایک مشغلہ ہوا کرتا تھا! مگر سبکدوش ہوجانے کے بعد انکو،صدیوں پرانے،مورخوں کے غفلتاً یا اراداتاً چھپائیگئے سانحات کو لایبریریوں و محافظ خانوں میں کھوجنے کا جنونی شوق ہے! بڑے میاں حساس دانشور اور دور اندیش مفکر ہونے کے ساتھ' وقت کے ساتھ بدل رہی زندگی' کا چشم دید گواہ ہے! نتیجتاً کارنو وایرس کے پھیلاو سے جڑے احتیاتی لاک ڈاون میں اپنے اپنے اعتقاد کی قوت یا اعتماد کی طاقت سے سنگین حالات کا سامنا کرنے والے گھر کے سبھی افراد پر اپنی نگاہیں جمی رکھنے کا عادی ہو چکا ہے! یہ مان کر کہ تواریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے وہ اپنے چشم دید واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے سنگین راتیں کاٹ کاٹ کر رنگین صبح کا انتظار کرنے کا عادی ہو چکا ہے!

بڑے میاں کی بیوی ایک رٹائرڑ سرکاری وکیل ہے!اور وہ ملازمت سے جڑی پابندیوں کو نظر انداز ہوئے بھی ہمیشہ جدیدت کی شکل میں اپنی صدیوں پرانی روایت پر عمل کرنے کی عادی ہو چکی ہے! اپنے اعتقاد سے اعتماد کو سینچ کر یہ مانتی ہے کہ کرم کرنے والا نیک کام کرنے والے عابدوں کو یقیناً، آج نہیں تو کل ستم سے نجات دلا دے گا!

بڑے میاں کا اکلوتا بیٹا یعنی درمیانے میاں، مختلف سرکاری محکموں کے بیشتر نظامی عہدوں پر اپنی قابلیت کی چھاپ چھوڑنے والا ایک سبکدوش ہوا ایک اعلی افسر ہے! وہ ایک تخلیق کار ہے جس کو اپنی ملازمت کے دوران حقیقی اجالوں میں خود دیکھے خود سنے بیشتر مصلحتاً نظر انداز ہو

چکے واقعات کے پس منظر میں، تازہ ترین زمینی واقعات کو ایک کینوا اس پر اتار کر رنگوں میں عیاں کرنے کا شوق ہے! اور وہ لاک ڈاون کا فایدہ اٹھا کر اپنے اکلوتے بیٹے یعنی چھوٹے میاں کو مصوری میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے!

جبکہ اپنی امیدوں کے چمک رہے واحد ستارے، اپنے پوتے میں بڑے میاں، مستقبل کے عکس دیکھ کر اسکو اپنے قریب رکھ کر اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے! دسویں جماعت کے ایک ذہین طالب علم پوتے کو دادا سے اپنے کمپیوٹر پر حاصل 'گوگل' سے میسر اطلاعت کے دم پر، ایک درباری کی طرح، ہر موضوع پر بحث کرنا عادت بن چکی ہے! دادا اس کی حوصلہ افزای کرتے ہوئے اس کے سوالات کے جوابات دیتا رہتا ہے!

چھوٹے میاں کی ماں ایک نفسیاتی امراض کی ماہر ڈاکٹر ہے! اور وہ یہ جان چکی ہے کہ اسکا نابالغ بیٹا گوگل کے اعتماد سے ایک مشینی انسان بن چکا ہے! اور وہ زندگی سے جڑے وقت کے بدل رہے رنگ وڈھنگ کو نظرانداز کرتے ہوئے مادیت پسند فیصلے لینے کا عادی ہو چکا ہے!

اپنے بیٹے کی مشینی سوچ سمجھ سے ابھری تدبیروں کے انجام سے خوفزدہ ہو جاتی ہے! فکر مند ماں یہ سوچ کر کہ اگر اسکے بیٹے کو ایک مونچھ والے چوہے کی بجائے ایک مونچھ والے شیر سامنے آگیا تو کیا ہوگا!؟ نتیجتاً ناداں بیٹے کی مشینی قوت کو انسانی طاقت میں بدلنے کی خاطر اسکے جذبات احساسات محسوسات اور خیالات کو ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کی ذاتی سوچ وسمجھ سے ابھرے حقیقی تاثرات کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے! اورزندہ رہنے کی کشمکش میں ضروریات زندگی کا احساس دلاتی رہتی ہے! اسکو من چاہی تدبیروں کی عمل میں لانے کی خاطر اس کے مشینی اعتماد کو انسانی اعتماد میں بدلنے کی کوشش کرتی رہتی ہے!

حقیقتاً طویل لاک ڈاون میں گھر کے سبھی افراد اپنی اپنی انفرادیت کو خاص اہمیت دینے کے باوجود کسی خیالاتی اختلاف کے بغیر اپنی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں! مگر جمود سے اوب چکے چھوٹے میاں کو اپنی ماں کے اعتماد سے جڑی منطقی کرامات کی کہانیاں سن لینے کی بجائے یا اپنی دادی کی اعتقاد سے جڑے دیوی دیوتاؤں کے کرشمات کی حکایتیں سن لینے میں دلچسپی رہتی ہے! ورنہ دادا کی زبانی تواریخی قصے سن لینے کا چسکہ لگ گیا ہے! تفریح سے زیادہ

معلومات حاصل کر لینے کی غرض سے اپنے دادا سے چپک کر انکی باتوں کو اپنے کمپیوٹر میں درج کرتے ہوئے تحقیقی سوالات کرنا اسکی عادت بن چکی ہے!

دادا اپنی آپ بیتی کے حوالوں سے جب اپنے اسکول و کالج میں دستیاب سہولیات کا ذکر کرتے رہتے ہیں تب پوتا یوں ہنس پڑتا ہے گویا اپنے موبایل پر کوئی لطیفہ سن کر یا پڑھ کر لطف اندوز ہو رہا ہو! امریکہ میں رہنے والے اپنے کزن سے روز موبائل پر گفتگو کرنے والا پوتا اپنے دادا کے ذاتی زندگی سے جڑے قصے سن کر قہقہے لگاتا رہتا ہے! مثلاً یہ سن کر کہ جب اسکے دادا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر دہلی کے لیے روانہ ہو رہے تھے تب ان کے سبھی رشتے دار بس اڈے پر انکو یوں وداع کرنے آئے تھے گویا وہ ایک ان دیکھی دنیا میں جا رہے تھے! دادا کے دور اندیش باپ نے تب بیٹے کو ایک درجن پوسٹ کارڈ دئے تھے! سبھی پر انکا ایڈرس لکھا تھا! اور وہ ہر مہینے انکو پوسٹ کرنے کے لیے تاکید کر رہے تھے! تب پوتے کے قہقہے سن کر جب دادا سکتے میں آ گیا تھا تب بیتے ہوے کل، آج اور آنے والے کل پر ہمیشہ نگاہیں جمی رکھنے والی ماں نے نادان بیٹے کو سمجھایا تھا کہ اس دور میں عام لوگوں کی جغرافیاء اطلاعات محدود ہوا کرتی تھیں!

پھر جواز سے متفق پوتے کو بڑے میاں نے قدیم مسودوں کے حوالوں سے ہزاروں برس پرانے تواریخی واقعات سنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا! اور ہزاروں برس پرانے کاینات کی بہبودی، عالم میں امن کی زندگی گزارنے کے مخصوص مقصد سے ایک جدو جہد کرنے والے اپنے فلسفی رشیوں کے تواریخی واقعات کا ذکر کرتے رہے! گنجان جنگلوں میں مہلک جسمانی بیماریوں سے نجات و ذہنی سکون کی تلاش کرنے بے ضرّر رشیوں پر چھپ کر تاک میں بیٹھے بھیانک راکھشسوں کے، اذیت ناک حملوں کا ذکر کرتے رہے! اور بار بار یہ بتایا کرتے تھے کہ دور اندیش مفکر اپنی چمتکاری قوت سے راکھشسوں کے اردگرد پھیلائے گئے انگاروں کو پھولوں میں بدل دینے کے عادی ہو چکے تھے! انکے حملوں کو روکنے کی خاطر برف کیتودوں کو شعلوں میں بدل کر جنگ کو ٹال دیا کرتے تھے!!

مگر توقعہ کے خلاف چھوٹے میاں نے ٹوک کر بڑے میاں کو گویا کمپیوٹر کا جواب سنا کر داستاں گو کو سختی سے ٹوک کر کہا تھا!

''احمق تھے وہ جن کو آپ مسیحائی کا درجہ دے رہے ہو دادا جی! اپنی قوت سے جنگلوں کو

خاک میں ملا کر راکھشسوں کے وجود کو مٹا دیتے تے تو حملوں سے ہمیشہ کے لئے بچ پاتے!''

جواب سن کر جب بڑے میاں کو گویا سانپ سونگھ گیا تب ماں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا!

''کاینات سے والہانہ محبت کرنے والے اشرف المخلوق ، اگر جنگلوں کو سپرد راکھ کر دیتے تب ان میں آباد رینگ رہے کیڑے مکوڑوں، چلتے پھرتے جانوروں اور اڑتے پرندوں کا وجود ختم ہو جاتا! پیڑ پودوں کے ساتھ زمین بھی جل کر آبی جانوروں کے وجود کو مٹا دیتی! اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خود کشی کے شکار ہو جاتے!

پہلی بار ماں کے جملوں کو کمپیوٹر پر پرکھنے کی بجائے پر انکو غور سے سن کر اور پھر سنجیدہ ہو کر، چھوٹے میاں اپنی آشفتگی سے جڑی سراسیمگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بول پڑا!

''بے بس زمینی و آبی مخلوق کا مسیحا لاچار انسانوں کو آدم خور کرونا وایرس کے قہر سے کیوں بچا نہیں پا رہا ہے ممی؟''

اسکی ماں خاموش رہی مگر اپنے پوتے کی کیفیت بھانپ کر اسکی دادی حفاظت کا یقین دلا کر سنجیدگی سے بول پڑی!

''چمتکار کرنے والا فرشتہ ، دنیا میں کہیں نہ کہیں جنم لے گا! مجھے دنیا بنانے والے کے نیک ارادوں پر اعتقاد ہے!''

دادی سے راکھشسوں کی خرافات و دیوتاؤں کے کرشمات کی بیشتر حکایتیں سن کر، اطمینان سے سو جانے کا عادی پوتا چمتکاروں سے متاثر ہو کر انکو قبول کرنے کا عادی ہو چکا ہے! نتیجتاً گوگل کی بجایا سکو دادی کے اعتقاد پر اعتماد ہے! چھوٹے میاں کے چہرے پر ابھرے معنی خیز تسلی بخش تاثرات دیکھ کر اسکی دادی اور ماں مطمین ہیں! بڑے میاں کی قلم ، قرطاس پر لکھتے لکھتے اور درمیانے میاں کا برش کینواس پر اسٹروک لگاتے لگاتے تھم گیتو دونوں سوچ کی عمیق گہرایوں میں غوطے لگا رہے ہیں! مگر یہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ فرشتہ کی شناخت کوئی اپنے اعتقاد کی قوت سے عیاں کر دے گا؟ یا مسیحا کو کوئی اپنے اعتماد کی طاقت سے کب اور کہاں جنم دے گا؟

کیا یہ جانکاری چھوٹے میاں کو 'گوگل' دے پائے گا؟! مگر کب؟



جواب دو!۔۔۔؟

شاردا اپنا آبائی گھر تیس برس پہلے کھو چکی ہے! گھر سے بے گھر ہوکر موروثی بسکین سے اپنے ہی وطن میں مہاجر اور پھر پردیس میں مہاجر بن جانے کی کشمکش زندگی سے جڑی کھٹی میٹھی یادیں اسکا تعاقب کرتی ہیں۔ اور صدیوں پرانی مسیحایی روایت کی اہمیت کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ نتیجتاً اپنے آبایی شہر سے ہزاروں کوس دور سڈنی میں پچھلے دس برسوں کے دوران مغربی رہن سہن کو اپنانے کے باوجود وہ اپنے سبھی تیوہار روایت کے مطابق منا رہی ہے۔

ہر روز پوجا پاٹھ سے سحر کا استقبال کرتی رہتی ہے۔ اور شام ہوتے ہی وہ ایک دیا جلا کر اپنے خوشحال بیٹے کے بنگلے کی دہلیز پر رکھ کر لو میں اپنے روشن مستقبل کے عکس دیکھتی رہتی ہے۔ پھر روایتاً اپنے پوتے کو رام لیلا، کرشن لیلا، اندر سبھا کی حکایتیں سناتی رہتی ہے۔ اور پھر مقصداً اپنی لوک کتھاوں کے ساتھ اپنے بزرگوں سے سنے عالم سے اتفاقاً چھپے یا اراداً چھپایے گیے سبھی قہر آدم کے تواریخی واقعات بھی سناتی رہتی ہے۔ صوفی سنتوں کے حوالوں سے ہم عشروں کو ایک دوسرے کے عقیدوں اور زندگی کا تحفظ کرنے والے واقعات سناتی رہتی ہے۔ غیروں کی پھیلایی نفرت کی تپش کو اپنے اتحاد سے محبت کی سہانی آنچ میں بدلنے والے ہم نوا امن پسند دانشوروں سے دہقانوں کا فخر سے ذکر کرتی رہتی ہے۔

کلہن کو اپنی دادی کی زبانی ایسے چونکا دینے والے تواریخی واقعات سن لینا اچھا لگتا ہے۔ گوگل سے تحقیقی سوالات پوچھ کر جوابات دیکھ کر حقایق کی تصدیق یا تردید کرنا اسکا ایک تنقیدی مشغلہ ہے۔ مگر دادی سے انکی آپ بیتی بار بار سنکر ہر بار جس سوال کا جواب گوگل نہیں

دے پاتا تو وہ سوال ہر بار دادی سے پوچھ لیتا ہے۔ مگر دادی موضوع بدل کر جواب ٹالنے کی عادی ہو چکی ہے۔

آج کلہن کا اٹھارواں اور شاردا کا اکاسیواں جنم دن ہے۔ اور شاردا اپنے پوتے کے سر پر ہاتھ رکھ کر آس پاس بیٹھے مہمانوں سے یوں مخاطب ہے گویا سنسنی خیز واقعات کی چشم دید گواہ اپنا بیان امر کروا رہی ہو۔ مہمان میزبان کی زبانی جو کہانی دلچسپی سے سنتے رہے وہ کلہن کئی بار دادی کی زبانی سن چکا ہے۔

سڈنی سے ہزاروں کوس دور ایک چشمے سے نکلے دریا کے کنارے کھڑی مسجد کے قریب ایک صدیوں پرانے چنار کا درخت ہے۔ اسکی چھاؤں میں ایک قدیم مندر ہے۔ مندر اور مسجد کے درمیان جو بہت پرانا مکان ہے وہ ہمارا گھر ہے۔ ہمارے بزرگوں کے دادا دادی سے ہمارے بچوں تک سبھی اپنے اعتقاد سے سینچے اعتماد سے کشمکش زندگی کو آسان بنانے کے عادی ہیں۔ قدیم مکان میں صدیوں سے موجود اپنے مسیحایی سنتری اور پاسبان، اندیکھے ان سنے 'گھر دیوتا' کی پرستش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ 'گھر دیوتا' کے کرم سے ہر ستم کو روکا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً ہم سب کو انکی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر صدیوں پرانی روایات پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

ایک دلکش سحر کے انتظار میں ایک پرسکون رات گزارنے کی خاطر ہم شام ہوتے ہی دہلیز پر ایک جلتا ہوا دیا رکھ دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اطمینان سے سوتے ہوئے جب کبھی بھونچال کے جھٹکے گہری نیند توڑ دیتی ہے تب ہم دہلیز پر پانی ڈالکر خدشات کو ٹالنے کی عادی ہو چکے ہیں۔ رات کے کسی پہر جب کبھی کتّوں اور بلیوں کے اونگھنے کے ساتھ پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی صدا سن لیتے ہیں تو اسکو الہام یا انتباہ مان کر صبح ہوتے ہی چرندوں پرندوں کو پیلے چاول کھلا دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ فطرتاً اچھی گائے بھوکے ہوتے ہوے بھی دودھ دیتی ہے۔ وفادار کتّا آفتوں میں بھی گھر کے در کو چھوڑ کر بھاگ نہیں جاتا ہے۔۔ خالصتاً برا بھوکھا سانپ دودھ پلانے والے کو بھی ڈنک مارتا ہے۔ مکّار چوہا گھر میں گھس کر گھر کی دیواریں کھوکھلی کرتا ہے۔ اور دروازے پر کھڑا مدد کا طلبگار اجنبی بہروپی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی ہم

اپنی روایات پر عمل کرتے ہوئے 'گھر دیوتا' کو خوش رکھنے کی خاطر سبھی کو کھلاتے رہتے ہیں۔

صدیوں سے اذانوں اور گھنٹیوں کی روحانی جگل بندی کے مدّاح، نفرت کی تپش کو محبت کی سہانی آنچ میں بدلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ صوفی سنتوں کے اصولوں کو اپنانے والے اپنے اتحاد سے ایک دوسرے کے عقیدوں اور زندگی کا تحفظ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مگر تیس برس پہلے جو ہوا وہ ہماری غفلت کا خمیازہ تھا یا حالات کی ستم ظریفی کا قہر۔

آنکھوں دیکھے تواریخی سانحہ کا آغاز ہماری صدیوں پرانی روایات سے جڑے کرم سے ہوا۔ ایک سازش کا شکار ہو کر، اپنی روایت کی عمل سے پہلی بار لرز اٹھے تھے۔ روایت کے مطابق، شام ہوتے ہی گھر کی دہلیز پر ایک جل رہا چراغ رکھ کر ہم سب اطمینان سے سو رہے تھے۔ مگر اس بار ہماری گہری نیند نہ بھونچال کے جھٹکوں سے ٹوٹ گیی تھی۔۔۔ نہ بادلوں کے پھٹ جانے سے۔۔۔ ہم اچانک جاگ پڑے تھے نہ محلے میں آگ لگ جانے کی کسی واردات کا شور سن کر۔۔۔ ہم جاگ پڑے تھے نہ جنگی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ سایرن کی آواز سن کر۔۔۔ ہم جاگ کر سکتے میں آیے تھے۔ بلکہ پہلی بار رات کے سنّاٹے کو چیرتی ہویی ایک پناہ کے طلبگار کی ملتجی سداوں نے ہمیں جگایا تھا۔۔۔ پھر جب تجسّس سوچ پر حاوی ہوا تو ہم نے اپنے دروازے پر ایک اجنبی آدم کو دیکھا تھا! مسلسل برف باری میں اپنا راستہ کھو چکے ٹھٹھر رہے پناہ کے طلبگار کو پوچھتاچھ کیے بغیر، اپنی روایت پر عمل کرتے ہویے اجنبی کو اپنے 'گھر دیوتا کے مہمان' کا درجہ دیا تھا!۔۔۔ مگر سحر کے اجالے میں خصلتاً ستمگر مہمان 'گھر دیوتا' سے جڑی ہماری سبھی روایات کو خارج کرتے ہویے بے نقاب ہو گیا تھا۔ سرحدی لڑاییوں میں کیی بار شکست کھا چکے شناسا حملہ آور نے جب اپنی فتح کا اعلان کر دیا تھا تب وہ ہم سب کو یرغمال بنا کر گھر کا مالک بن چکا تھا۔

ستم سے لرز کر شاید ہم اعتقاد کھو چکے ہوتے اگر ایک نیک پڑوسی اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر ہماری مدد نہ کر پاتا۔ گویا یہ 'گھر دیوتا' کا ہی کرم تھا کہ ہم چھینے ہوئے گھر سے اکھڑ کر،۔۔۔ اپنوں سے بچھڑ کر،۔۔۔ اپنی اپنی موروثی زمین جایداد چھوڑ کر، فقط اپنا تشخص بچا کر، اپنے ہی ملک میں مہاجر بن جانے میں کامیاب ہو پایے تھے!

کلہن نے ٹوک کر کہا'' دادی کو صدیوں سے تحفظ کرنے والے اپنے ہم عصر، امن پرور عقید تمندوں پر ناز ہے۔'' اور پھر دادی سے مخاطب ہو کر وہی سوال پوچھا جسکا جواب نہ وہ دے پایی ہے اور نہ گوگل ہی دے پایا ہے۔'' دادی جن ہم نوا دانشوروں سے دہقانوں تک سبھی پر آپکو ناز ہے، وہ آج بھی دہشت گردی کے تماشایی کیوں بن گیے ہیں؟۔۔۔کیا کویی خاص وجہ یا وجوہات ہیں؟؟۔۔۔اب تو جواب دو دادی۔۔۔؟؟؟ دادی اس بار خاموش نہیں رہی! بلکہ جواب دیے بغیر خاموش ہو چکی دادی کو دیکھ کر کلہن سکتے میں آ چکا ہے!!



پھر کیا ہو گا سر جی؟

یہ وقت کا کرم ہے کہ ہم دونوں فلم نگر کے بیشتر سٹوڈیوز میں تیس برس سے جال اور مچھیرے کی طرح چولی دامن کا ساتھ نبھاتے رہے ہیں۔ اور یوں؟ غیر معمولی واقعات سے جڑے حالات کا سامنا کرنے کے لئے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یقیناً یہ وقت کا ستم ہے کہ میں آج نظریں جھکا کر غصے کی گرج کے ساتھ آپکی شکایتیں بطور الزامات سن رہا ہوں سر جی۔

میں یہ مانتا ہوں کہ لاکھوں کی لاگت سے بنائے گئے قدیم قلعے کے جس سیٹ کو اس وقت چکا چوند روشنی میں توّجہ کا مرکز ہونا چاہیے تھا وہ میرے جونیر آرٹسٹس کی پھیلائی گئی دھند میں کھو گیا ہے۔ مگر دھند سے خوفزدہ حساس فنکار خودکشی نہیں کر سکتے سر جی۔ دماغ کے بجائے دل سے سوچنے والوں کی عمل منفی نہیں ہو سکتی ہے۔ وثوق سے کہہ رہا ہوں کیونکہ اسکی، میری، بلکہ آپکی بھی داستانیں ملتی جھلتی ہیں سر جی۔ آپ تب صحافت کے صاف آئینے میں حقیقی زندگی کے عکس دکھانے کے لئے مشہور اور معروف تھے جب آرٹ یا متوازی سینما کی لہر میں شامل ہونے کی خاطر فلم نگر میں آئے تھے۔ مگر اپنی فلم بندی کی جانکاری کی وجہ سے ایک قدرداں پروڈیوسر کے قابل اعتماد پروڈکشن کنٹرولر بن گئے۔

یہ سچ ہے نا سر جی!

جبکہ میں وہ قلمکار تھا جو استعاری، علامتی، یا ادبی تحریری اظہار سے اوب کر سچّی کہانیوں کو اپنے حقیقی رنگ و بو اور آوازوں کے ساتھ سنے سکرین پر دکھانا چاہتا تھا۔ اسٹوڈیوز

کے چکّر لگاتے لگاتے ان ہنرمندوں کا ہمسفر بن گیا جنکی صحبت میں ناکامیوں کے کرب وکراہن سے راحت ملا کرتی تھی۔ ۔! اور برسوں بعد آج بھی اپنے آپ کو بطور سٹرگلر متعارف کرنے والوں کو فلموں کی کاسٹنگ کے لئے کراوڈ، ایکسٹراز یا جونیئر آرٹسٹس مان کر انکی صلاحتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے انکے خدوخال دیکھ کر مخصوص گیٹ اپ میں کبھی سپاہی یا درباری اور کبھی درویش یا ڈاکو بنا کر روشنی کے سامنے لاتے رہے ہیں۔ پھر شوٹ ختم ہونے کے بعد انکو یومیہ اجرت دیکر اگلے شیڈیول تک ڈراونے اندھیروں میں دھکیلتے ہیں۔ مگر اپنی خووضع کو چھوڑے بغیر وہ تلخیوں کو امیدوں کے رنگوں سے شوخیوں میں بدل کر سنگین راتیں گزار کر سحرانگیز سحر کا انتظار کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

یہ آپ بھی جانتے ہونا سرجی!

فلم نگر میں جونیئر آرٹسٹ کی کمی نہیں ہے۔ مگر چونکہ جنکی شناخت سپر سٹارز کے ساتھ فلم بند ہو چکے مناظر میں درج ہے انکو بدلا نہیں جا سکتا۔ انکو فلم کا آخری شیڈیول پورا کرنا لازمی ہے اس لئے انکی غیر موجودگی قانونی محادے کی خلاف ورزی ہے۔ میں یہ اصولا" قبول کرتا ہوں لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ انکی عمل میں، انکی فطرت، خصلت یا عادت کا دخل نہیں ہے سرجی!

جو ہوا وہ اتفاقاً یا غفلتاً پیش آیا حادثہ بھی نہیں ہے بلکہ انکی بدلی سوچ اور سازگار حالات میں اراداً اور مقصداً تشکیل دیا ایک کارنامہ ہے سرجی! یہ سچ ہے کہ مایوسیوں کی عمیق گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر وہ فلموں سے اوب گئے ہیں۔ وجہ یہ کہ سال دو سال وہ بڑے پردے میں اپنے آپکو ڈھونڈ نہیں پائے ہیں۔ جبکہ ٹیلی وژن میں اپنی شمولیت کو وہ تنکوں کا سہارا مان کر اپنے وجود سے مطمئن ہیں۔ روز کسی نہ کسی چینل پر اپنے آپ کو بھیڑ میں بھی پہچان کر خوشیاں منانے کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں جب کبھی انکی خوشیوں میں شریک ہو جاتا ہوں تب یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میری خواہشات کے سوکھے پتے امید کی نمی سے منی پلانٹ کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ اور میں تصورات کی دنیا میں خود دیکھے، سنے تواریخی، صقافتی، سماجی، اقتصادی، دفاعی واقعات کو خراشے تراشے بغیر سچّی کہانیوں کو ٹیلیوژن کے کروڑوں ناظرین کو خود دکھانے کی

تیاریوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں سر جی۔

کل رات ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر ایک تخلیق کار اپنے فنکاروں کو شوٹ کے بارے میں اطلاح دینا بھول گیا سر جی۔ میں یہ مانتا ہوں کہ میری غفلت کی وجہ سے اگر شوٹ مکمل ہو نہیں پایا تو یہ سیٹ توڑ کر پھر سے کھڑا کرنا پڑیگا۔ اور جانتا ہوں کہ آپ مالی نقصان کے علاوہ سپر سٹارز کی ڈیٹس ملنے کی مشکلات سے خوفزدہ ہیں اس لئے آپ میرے خلاف محادے کی خلاف ورزی کی کاروائی کرنا چاہتے ہیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ درد دینے والے ہمیں دوا دے سکتے ہیں میں یہ وعدہ کرر ہاہوں کہ کل سیٹ کو جگمگا دونگا سر جی۔

یہ سچ ہے کہ جن ہم نفس، ہم نوا فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے کرتے میں انکا محافظ اور پھر مہتمم یعنی ایکسٹرا اسپلایر بن گیا ہوں۔ وہ نہ بندھوا اور نہ میرے ملازم ہیں۔ وفا کے خوگر جفا نہیں کر سکتے ہیں۔ میری کیفیت بھانپ کر میرا ساتھ دینگے۔ یہ میرا دعوا ہے سر جی! وہ کل شوٹ پر آ کر دوسری شفٹ میں کام کر کے آج کے نقصان کی بھرپائی کر سکیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے سر جی۔ مجھے ایک دن کی مہلت دیں سر جی۔

******

سحر کی سحر انگیز روشنی میں قلعے کا خاموش سیٹ دیکھ کر رنجیدہ ہوتے ہوئے بھی میں کچھ کہنے کے لیے سنجیدہ ہوں سر جی۔ جال کانٹے دیکھ کر بھی ننگے پاوں پانی میں چل رہے انجان مچھیرے کو روک نہیں پاتا ہے۔ اور بے زبان ہونے کی وجہ سے نہ خود کو تار تار ہونے اور نہ مچھیرے کو لہولہان ہونے سے بچا پاتا ہے۔ میں چپ رہوں تو ہمارے ذاتی مصلے کو ایک سنسنی خیز اور عبرتناک عالمی تناضہ بنانے والے ہمارے انجام کو قہر آلودہ بنا دینگے سر جی۔

زباں کی لرزش احساس جرم کا تاثیر نہیں ہے بلکہ گوونداکے خدشات سے ابھرے خوفناک امکانات کا اثر ہے سر جی۔ گووندا جو ''رام لیلا''، ''کرشن لیلا'' اور ''اندر سبھا'' ڈرامہ کے تینوں رنگ و بو سے واقف ہونے کے سبب تیس برس پہلے ایک دھارمک سیریل کا صلاحکار بنکر یہاں آیا تھا اور آجکل اپنی متاثر کن مسکراہٹ کی وجہ سے یومیہ اجرتوں پر فرشتوں یا دیوتاؤں کے گیٹ اپ میں کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ کیمرہ کے پیچھے بھی مسکراہٹیں بکھیرنے والا کل نشے میں چور

تھا سر جی۔

کبھی کھو کھلے قہقہے لگا کر چانکیہ اور ارسطو کا ذکر طنزاً کرتا رہا اور کبھی بلک بلک کر روتے ہوئے جشن مسّرت میں جھول رہے ہمسفر فنکاروں کے انجام کی تشویشناک قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ انکے بارے میں کھوج پوچھتاچھ کی تو چاینا کے مفکّر کنفیوشس کے ان اپنچی پیروکاروں کا ذکر چھیڑکر مجھے گویا نیند میں چلتے چلتے ایک احساس برق سے بیدار کر گیا۔ اور یہ ثابت کر گیا کہ وہ، میں بلکہ آپ بھی سٹوڈیوز کے اندھیروں اور الجھنوں میں تصوّراتی زندگی دیکھ کر حقیقی زندگی سے الگ ہو چکے ہیں سر جی۔

ہوا یوں کہ کل صبح تاکید کے باوجود مجھ سے ملے بغیر شوٹ پر نکل پڑے تو میں نے انکا پیچھا کیا۔

مگر میری مشکوک تحقیق جب تذبذب کے بجائے ایک دلکش تجّسس میں بدل گیا اور میں انکی کارکردیوں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پہلی بار انکو کسی سٹوڈیو کے سیٹ یا منتخب لوکیشن کے بجائے ٹریفک کو مفلوج کرتے ہوئے بہت سارے کیمراز کے سامنے دیکھ کر سہانا تعجب دلچسپ بن گیا سر جی۔ بغیر میک اپ کیے شوٹ کی اہم ضروریات سمجھے بلکہ لائیٹ آن، ساونڈ آن اور کیمرہ رولنگ کے بعد ایکشن کی آوازیں سنے بغیر وہ ایک متاثر 'سٹریٹ پلے' کرتے رہے اور بغیر رٹیک کے شاٹس کیا ایک لمبے سین کو ایک ہی ٹیک میں مکمل کر گیے سر جی۔ ایک لمبے سین کو ایک ہی ٹیک میں مکمل کر گیے سر جی۔

یہ سوچکر کہ انکے مخصوص ہنر سے جڑے تریق کار کو اپنا کر ہم ڈبل شفٹ میں دس دن کا شیڈول چار دن میں مکمل کر سکتے ہیں، میں نے انکو چار گنا اجرت لیکر آپکے سیٹ پر لوٹنے کی پیشکش کی تھی۔ اسکی رضامندی لینے کی خاطر گووندا سے پوچھتاچھ کر رہا تھا سر جی۔ مگر ان سے روبرو ہونے کی چاہت کو تب ایک اذیتناک تشویش نے تب دبوچ ڈالا جب گووندا نے یہ آگہی دی کہ وہ سب محسن کی ضد پوری کرنے کی خاطر میری توقعات سے جڑی ضرورت کو ٹھکرا کر میرے دعوے اور وعدے کو کھوکھلا ثابت کر گئے ہیں۔ اور پھر محسن کے بارے میں جانکاری دیکر یہ اطلاع دے گئے کہ میں نے اپنی خودکش پیشکش سے نہ صرف مسئلے کو سلجھانے کے بجائے الجھا

دیا ہے بلکہ محسن کو بھی للکارا ہے۔

محسن اسکا نام یا تخلص نہیں ہے بلکہ الہام سے جڑے اسکی چمتکاری نمود سے آفتوں کے وجود کو ٹالنے والے کو احسان مندوں کا نوازا لقب ہے سرجی۔ لیکن گوونداجانتا ہے کہ ردئی کے گدام میں بغیر دھویں اور بو اندر ہی اندر لگ چکی آگ سے بچنے والا محسن خود ہی انگارڈالکر، آگ سلگا کر اپنے مسیحائی نمود کی نمائش کرنے میں ماہر ہے سرجی۔

محسن ایک قلمکار یا تخلیق کار نہیں ہے۔ وہ تواریخی، صقافتی، سماجی، اقتصادی یا دفاعی معاملات کا صلاح کار، تنقید یا تحقیق کار نہیں ہے۔ جمہوری نظام کا رکن، سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ دار بھی نہیں ہے سرجی۔ مگر حبیب بنکر اہم لوگوں کی زندگی میں داخل ہو کر انکی کھٹی میٹھی کارکردیوں کا جائزہ لینا اسکی فطرت ہے۔ پھر طبیب بنکر پھنسیوں کو خرچ خرچ کرنا سور بنا کر مسیحائی کا دعوا کرنا اسکی خصلت ہے۔ اور یوں حنیفوں، حریفوں اور رقیبوں کی پوشیدہ کارکردیوں کے سنسنی خیز انکشافات سے تذبذب اور تجّسس پیدا کرنا اسکی جنونی عادت ہے۔

اپنی عالمی احمیت سے عظیم ہونے کی نمائش، ہر خاص و عام کو سکھ دکھ سے واقف ایک عادل شہنشاہ کی طرح ہر شب کو ٹیلیوژن پر کروڑوں ناظرین سے مخاطب ہو کر وہ فریادیں سن لینے کی نمائش کرتا رہتا ہے اور ارادتاً انکے آندھیوں سے لرزتے چراغوں سے جڑے ڈراونے اندھیروں کی پیشن گوئیاں کرتے ہوئے اپنے مسیحائی نمود کو اجاگر کرنے میں اسکو مہارت حاصل ہے۔

غور طلب مسائل کو سلجھانے کے بجائے اپنے چنندہ انکشافات کے تشویشناک امکانات سے ناظرین کو پہلے خوفزدہ کرنا اور پھر انکی توجّہ قواید اور قانون سے جڑے حکیموں، محافضوں اور منصفوں کس ضرورت سے ہٹانا، اپنے عالمی بحثوں میں شریک ہم خیال صحافیوں یا دانشوروں کی مسیحائی احمیت کو عالمی صطح پر درج کرانا اسکی قابلیت ہے سرجی۔

حوس اور حرس کا عاشق محسن اپنی قابلیت سے فتح کی گئی شہنشہائی احمیت کو قائم اور دائم رکھنے کی خاطر سماجی، صقافتی، سیاسی واقعات کو واردات بنانے یا مصلوں کو تنازوں میں بدلنے کی خاطر حقیقت پر گرہن لگا دینے والے فتنوں کی کھوج کرتا رہتا ہے۔ پھر انکی مقصوص بناوٹ،

سجاوٹ اور دکھاوٹ سے ابھری مطلوب پیچیدگیوں کے تلمساتی نمود سے وہ مسائل حقیقی وجود کو تحس نحس کرتا ہے۔ گویا تحقیقات یا مقدمات میں شک وشبہات کا نقطہ، لکیر، جملہ یا داغ لگا کر حمام میں ننگے مجرموں کی سزا روک کر انکو ملزم نامزد کرتے ہوئے کبھی نہ ختم ہونے والے سرکاری یا غیر سرکاری عالمی بحثوں کے سپرد کرتا رہا ہے۔

کل کا سٹریٹ پلے ایک سیاسی جماعت کی مخصوص ٹوپیاں پہن کر اور ہاتھوں میں تختیاں لیکر شوٹ میں دیکھ آیا ہوں۔ اور آج گووندا بھی دوسری جماعت کی ٹوپی پہن کر کالی جھنڈیاں لہرا کر کیمرہ کے سامنے ہے سر جی۔

اپنی سدھ بدھ کھونے سے پہلے گووندا یہ مشورہ دے گیا کہ ہمیں محسن کے دیئے گئے نشے میں خوشیاں تلاش کرنے والے فنکاروں کو بچانا چاہیے سر جی۔

ہمیں اپنے ذاتی نقصاندہ واقعے کو ایک عالمی المیہ بننے سے روکنا ہوگا سر جی۔

محسن نے نعش میں آکر آج شب کو جونیر آرٹسٹس کو تازہ ترین سٹریٹ پلے کی ساتھ آپ کی تقریباً مکمل فلم پر کبھی نہ ختم ہونے والی بحث چھیڑ دی تو؟

فلم کو ڈبوں میں عمر قید کی سزا ملی تو؟

پھر ہم تینوں کا کیا ہوگا سر جی؟



یہ دیش کون ہے۔۔۔؟

خوش ہوں کہ میں ہزاروں کلومیٹر دور بدیش میں رہتے ہو؟ بھی عالمی ٹیلی وژن کی مدد سے اپنے وطن اپنے برصغیر سے جڑا رہتا ہوں۔اپنے پوتے کو اشوک یا جودھا اکبر جیسے تواریخی سیریل ساتھ بٹھا کر دکھانا میری عادت بن چکی ہے۔اسکی انٹرنیشنل اسکول سے پیدا کی گئی عالمی سوچ میں اپنی مخصوص سوچ سمجھ کی لطف اندوز چاشنی کا مقصد ڈالنا میرا واحد مشغلہ ہے۔دراصل انٹرنیشنل زبان بولنے والے پوتے کو اکثر اردو ہندی الفاظ کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے مادری زباں کے پیوند لگا کر وقتاً فوقتاً اسکے ساتھ کی گئی گفتگو کی خوشبو سے ماضی کو مستقبل سے جوڑنے کی جنونی حرکت جاری رکھتا ہوں۔

میرے ملک کی پارلیمنٹ چند لوگوں کی ضد کی وجہ سے جمود میں آچکی ہے۔ذی ہوش جمہوریت پسند ہوں اس لیے کوئی سبق آموز سیریل دیکھنے کے بجائے سنجیدگی سے سبھی عالمی ٹیلی وژن نیوز چینل دیکھ کر کبھی تلملاہٹ اور کبھی گھبراہٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔کیونکہ مباحث میں سوالات کی بوچھاڑ کرنے والے اور کھوکھلی باتیں کرنے والے شرکا گرجدار آوازوں میں حالات اور واقعات کا جائزہ یا جواز بیاں کرنے کے بجائے بے شکل خطروں کے حوالے دیکر دیش کو بچانے کے مطالبات کرتے ہوئے اپنی مسیحائی کا اعلانات کررہے ہیں۔

اپنے لیپ ٹاپ پر اسکول کا ہوم ورک کررہا میرا پوتا میرے چہرے سے عیاں تذبذب کو بھانپ کر بن بلائے میرے ساتھ ساتھ بحث میں شریک سیاست دانوں، مفکروں اور صحافیوں کی باتیں دلچسپی سے سن رہا ہے۔اور آج پہلی بار مجھ سے ایک سوال پوچھ بیٹھا ہے”دادو!

یہ دیش کون ہے جسکی فکر سبھی کر رہے ہیں''۔ جواباً میں نے بتایا کہ فکر مند شر کا کسی شخص یا شخصیت کے بارے میں ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ دیش یعنی کنٹری کی سلامت کے لئے اپنی مسیحائی وجود کو نمایاں کر رہے ہیں۔ لیکن میں رہبری کا دعوے اور وعدے کرنے والے ان رہزنوں کو بے نقاب نہیں کر سکا جو عوام دشمن گھٹالوں کے مجرم ہیں یا اپنی غیر جمہوری کارکردگی کی وجہ سے الیکشن ہار چکے ہیں۔ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اپنے ذہین پوتے کو دنیا میں سب سے بڑے جمہوری نظام کے وہ رنگ کیسے دکھا سکوں جو پوشیدہ تو نہیں ہیں مگر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے عیاں نہیں ہو پاتے ہیں۔ کیا کوئی ہم عمر یا کم عمر مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ میں ایسا کیا کروں تا کہ رنگ بدلنے والے رقیب کا روسیاہ اپنے پوتے اور آنے والی نسلوں کو دکھا سکوں!



انوکھا کھیل

پردیس میں رہنے والے میرے ہم نفس میرے ہم نوا! میں تم سے مخاطب ہوں! ہم دونوں ایک دوسرے کی کشمشِ زندگی سے آشنا ہیں! جمہوری نظام میں کبھی قہرء خدا کے ستم کو ختم کرنے کے تماشہ ئکرم اور کبھی آدم کے کرم سے ابھرے ستم کے کھیل دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں! اوراس بار سوچتے رہے کہ 'کرونہ' قہرِ خدا ہے یا قہرِ آدم! قیامت کی شکل میں نظر آرہے خدشات پر حاوی ہو کر جب آدم کی مسیحائی ایجادات راحت کا احساس دلا رہی تھی، یومِ جمہوریت نے خدشات کا ایک ڈراونہ منظر دکھا کر ہم دونوں کو خوفزدہ کر دیا! ہاں دونوں کی ذہنی کیفیت ایک جیسی تھی! گویا کینسر وارڈ میں ملک الموت کے روبرو مسیحائی چمتکار کے منتظر دولاچار ذی ہوش بیمار! مگر تم یہ نہیں جانتے کہ میں سو دن سے چل رہے اندولن سے جڑے قہر کے قیامت خیز خدشات سے لرز رہا ہوں جو جمہوری نظام میں سیاست دانوں کے ذاتی اختلافات کے ٹکراو سے مصداً پیدا کیے جا رہے ہیں! سوچ رہا ہوں کہ حکومت کی ارادتاً مخالفت کرتے ہوے بغاوت کرنے والے سیاست دانوں نے فیکٹری بند کروادی تو میرے بیٹے کی نوکری بھی چلی جاؤ گی! اندا تا کسان اناج تو پیدا کرتا رہے گا، مگر بیروزگار غیر کسانکو 'انداتا' کیا مفتاناجدیگا؟ سوچ رہا ہوں کہ میں اپنے پر پے پوتیوں کو جدید تعلیمی تربیت دینے کی بجاے ہل چلانا سکھادوں تاکہ وہ انکم ٹیکس دیے بغیر عظیم غریب ملک کے 'ان داتا' بن کر، عالیشان زندگی بسر کر پاسکیں! لیکن میرے مرحوم دادا کی زمین، جمہوری سرکار ستّر برس پہلے معاوضہ دیے بیر، چھین کر اناج پیدا کرنے والے کاشتکاروں کو دے چکی ہے! کیا کروں! اقتصادی بحران کا بے بس تماشای بنا رہوں یا سیاسی کھیل کو سمجھنے کی کوشش کروں!؟



ایک سوال اور!

شخصی نظام میں حکمرانوں کے آمرانہ حقوق کی بربریت کے شکار، انسانی حقوق سے محروم لاچار عوام کو ہر دور میں مذہبی پیغمبر سماجی رہبر یا اشرف المخلوق مفکر، انکو اپنی تدبیروں سے تقدیروں کو بدلنے کی رہبری کیا کرتے تھے! مگر یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ جمہوری نظام میں جمہوریت کی حفاظت کرنے کا دعوی کرنے والے رہبر، آئینی حقوق کی آڑ میں، آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کو نظریاتی اختلاف کا نام دے کر، آئینی حکمرانوں کے سماجی دفائی اور اقتصادی انقلاب کی مخالفت بغرض مخالفت کرتے ہوئے دہشت گردی اور کرونا وایئرس کے پھیلاو کی روک تھام کی تدبیروں کو سیاسی رنگت دے کر فتنوں کی سیاست کرنیکے عادی ہو چکے ہیں!

ملک کے قوائد اور قوانین کو ارادتاً توڑ کر، سرکار کے مفید مشوروں ہدایات اور انتباہ کو ٹال کر، اپنے آئینی حقوق کی آڑ میں اپنے فرائض واوروں کے انسانی حقوق دونوں کو نظر انداز کرنے والے ہزاروں کسانوں نے جب سے قومی شاہرہ کو دبوچ کر اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے راستے بند کر دئے ہیں تب پنچاعتوں سے پارلیمنٹ تک کے سبھی انتخابات میں کھو چکے اپنے وجود کو عیاں کرنے کی خاطر ریل روکو، چکا جام ہڑتالوں اور دھرنوں کی سیاست کرنے والے ان کی حمایت کرتے رہے ہیں! اور انسانی حقوق کے خود ساختہ ترجمان اپنی وضاحتوں سے ان کی آئینی قوانین کی انقلابی ترمیم کو رد کرنے کی مانگ سے جڑے دھرنے کو، اپنی حمایت سے عالم کی توجہ کا مرکز بنا چکے ہیں!

میں ایک صحافی ہوں اور صحافت کے آیئنے میں سنئے سنائے سنسنی خیز حالات کے عکس

دکھانے اور متضاد سیاسی بیانات کو اہمیت دینے کی بجائے، کئی مہینوں سے جاری دھرنے پر اپنی نگاہیں جمی رکھ کر زمینی حقیقت کو عیاں و بیاں کرنے کا عادی ہو چکا ہوں!

قومی شاہراہوں پر خیمے لگا کر ٹریفک کو روک کر خود بسائی بستی میں، آس پاس گاؤں و شہروں سے اپنے ٹریکٹروں و کاروں میں آنے جانے والے رئیس زمینداروں کے جدید طرز کی زندگی سے آشنا ہوں! شہر کے بازاروں کو زبر ستی بند کروانے والوں کی زندگی کی ضروریات مفت دستیاب ہونے کیلئے، انکے ارد گرد سجائے مینا بازاروں اور لنگروں کو دیکھنے کا عادی چکا ہوں! اور انسانی حقوق کی آڑ میں مل رہی مفت پانی اور بجلی کے ساتھ انٹرنیٹ کی سہولیات کے ساتھ گویا ایک میلے میں بیشتر سہولیات کے ساتھ انکو اپنے بزرگ والدین کے ساتھ اطمینان سے رہنے والے ہزاروں مظاہرین کو دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں!

سیاست کی بجائے انسانیت کے ناطوں سے، ایک مقصد کی خاطر کئی مہینوں سے: ملک کے تمام کسانوں کی نمائندگی کا دعوی کرنے والوں کی، سرکار کے اقتصادی انقلاب سے جڑی ذرعی قانون کے بہتر آئینی ترمیم کو 'کالے قانون' کا نام دے کر اسکورڈ کرنے کی مانگ سے میں آشنا ہوں! اور کئی مہینوں سے روز ایک سجے جائیے اسٹیج پر، گویا ایک سٹوڈیو میں ایک فلم کی شوٹنگ کیلئے ہدایتکار کے اشارے کے ساتھ کردار حرکت میں آ کر؛ اپنی مخصوص ٹوپیاں پہن کر اپنی شناخت بطور 'ان داتا' کرانے والوں کو، کبھی تمہید باندھ کر اپنے دھرنے کی وکالت کرتے ہوئے، کبھی اپنائیت کے احساسات دلا کر اپنی مانگ کی وضاحت کرتے ہوئے، کبھی طنزاً اکسا کر اپنی اہمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور غصے سے چلا کر بغاوت کا ڈنکہ بجا کر جمہوری حکومت سے ٹکرانے کی بے قابو سرگرمیاں کو دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں! مگر اچانک وہ دیکھ کر چونک پڑا ہوں جو میں دیکھنے کا عادی نہیں ہوں!!

پہلی بار ان داتاوں کو صحافیوں، سیاسی سماجی اقتصادی مبصروں سے معنی خیز گفتگو کو میڈیا کے کیمروں کے سامنے انکو سرکار کے خلاف ایک مخصوص سیاسی جماعت کی انتخابی مہم میں شامل ہوتے دیکھ کر سراسیمگی کا شکار ہو چکا ہوں! اور یہ طے نہیں کر پارہا ہوں کے کہ کسان سیاست دانوں کی ہدایات پر دھرنے پر بیٹھے ہیں یا سیاست دان دھرنوں کی مدد کے طلب گار ہیں!

پھر دونوں کو ایک جیسے جوازات کی آڑ میں، تیل وگیس کی مہنگائی کے خلاف احتجاج کو چناؤ پروپگنڈہ میں اپنی سیاسی اہمیت کو عیاں ہوتے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی! وہ اسلیئے کہ دونوں بڑھ رہی قیمتوں سے اقتصادی بہران کے خدشات کے خلاف اٹھائی گئی آواز کروڑوں غریبوں کی آہ وزاریوں کی ترجمانی کر رہی تھی! مگر اس سے پہلے کہ اور میں انکے عوام سے جڑ جانے کے عزم دیکھ کر انکی بغاوت کو انقلاب کا نام دے پاتا زمینداروں نے، مہنگائی کے باوجود گیس پیٹرول کے ذخیروں کے علاوہ، چھ مہینے کیلیئے اپنی ضروریات زندگی کو اپنے گوداموں رکھ کر، اپنی مکمل تیاریوں کا حوالہ دے کر اپنے دھرنے کو جاری رکھنے کے اعلان سے مجھے چونکا دیا! اور عالمی توجہ کا مرکز بن چکے دھرنے سے بند کیئے گئے راستوں پر دھرنے کے اختتام کے منتظر عام لوگوں کو گویا برق کے جھٹکے سے ہلا دیا! اور میں ہنر مند اور غیر ہنر مند پیشوں سے جڑے اپنی دوکانوں، اپنے کارخانوں اور تعمیر و ترقی اداروں سے کٹ چکے اور معاشرے کی خوش حالی سے جڑے، کرونا وایئرس کی روک تھام کے سبھی حفاظتی اقدام اپنانے کے باوجود اقتصادی بہران کے شکار لاچار عوام کی، زمینداروں کے جوشیلے تقریروں اور دھمکیوں کے شور سے دبّی غور طلب سرگوشیاں سن کر سکتے میں آگیا ہوں!

اور یومیہ اجرتوں پر روزگار کرنے والے محنت کش مزدوروں، کاشتکاروں پیہ ور کاریگروں بے روزگار نوجوانوں اور اپنی یومیہ آمدنی سے گھر گھر جا کر، سبزیاں، اخبار، پانی، آئس کریم کھلونے غبارے بیچنے والے، کپڑوں کو استری کرنے والے مالش کرنیوالے، بوٹ پالش کرنے والوں کی آپ بیتی کے حوالوں سے جگ بیتی سن رہا ہوں! خاص طور پر گیس اور پیٹرول کی بڑھ رہی قیمتوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنی یومیہ کمائی سے ہر روز بازار سے ایک کلو چاول یا آٹا خرید کر، لکڑیوں سے چولہا جلانے والے اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی داستاں حیات سن رہا ہوں! میں ایک ایماندار صحافی ہونے کے ناطے اپنے کروڑوں ہم وطنوں کو حاضر ناظر رکھ کر وثوق سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ذکر ہوگا جب اس دور کی قیامت کا، کرونا وایئرس میں ہو رہے دھرنوں کی بات یقیناً ہوگی!

اپنی صحافت کے آئینے میں چشم دید واقعات کے حقیقی عکس دکھا کر دھرنوں کے خالقوں

سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ سڑکوں پر ٹریکٹر چلا کر اپنی کامیابی کی فصل کاٹنے کے خواب دیکھ رہے ہیں؟ بغاوت کا بیج بو رہے ہیں؟ یا پھر ہوس وحرس کی خاطر کندھے سے کندھا ملا کر ساتھ دینے والے اپنوں کو، کرونا وایرس اور محنت کش غیروں کو اقتصادی بحران کے شکار بنانے جا رہے ہیں؟

اور سرکار سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ یہ فیصلہ کر پایں گے کہ دھرنوں میں ماہروں کو انقلاب کی جوت نظر آرہی ہے یا بغاوت کی بو آرہی ہے؟ اگر زمیندار انقلابی ہیں تو انکی مانگیں پوری کر کیوں نہیں دیتے؟ اور اگر وہ بغاوت کر رہے ہیں تو اسکو کچل کیوں نہیں دیتی ہے!؟

ایک سوال اور جو میں عالم کے دانشوروں مفکروں قانون دانوں اور انسانی حقوق کے محافظوں سے پوچھنا چاہتا ہوں! پیشہ ور قاتلوں کو ارادتاً بار بار اپنی قابلیت سے بری کرنے والے وکیلوں کی عزت افزائی ہونی چاہے یا مذمت!؟۔۔؟؟



سراب !

ذی ہوش بیٹی جانتی ہے کہ جیسے سرکار کو دفاع کے لئے اٹم بم ہوتے ہوئے بھی اپنے سرحدوں کی زمینی حفاظت کرنا ضروری ہے! ویسے ہی کیوڈ-19 کے بچاؤ کیلئے ویکسین دستیاب ہوتے ہوئے بھی ہمیں سوشل دوریاں رکھنا اور احتیاتاً ماسک پہن لینا لازمی ھے! اسلئے وہ شہر میں ہر خاص وعام کے ایک دوسرے سے احتیاتاً دوری رکھنے کی خاطر شہر میں نافظ ہو چکے دفعہ 144 کو بھی لازم اہمیت دے رہی ہے! اور پڑوسیوں رشتے داروں ایمبولنس اور ٹیکسی والوں کی سرد مہری وبے رخی کو حالات کی ستم ظریفی کا عنوان دے رہی ہے!

لاچار بیٹی جب اپنی بوڑھی ماں کے سینے میں ہو رہی جلن کی شدّت کو محسوس کرتے ہوئے خدشات سیلرزا اٹھی تب اسنے ماں کو اسکوٹر پر بٹھا کر فوری طور پر اسپتال پہنچانے کی کوشش کی! مگر گھبراہٹ کے دباو میں آکر اسنے سفر میں حفاظتی اقدام سے آشنا ہوتے ہوئے بھی نہ ماسک پہن لیا اور نہ ہیلمیٹ! مگر قانون کی خلاف ورزی کرنے والی ذمہ دار شہری کو اپنی غفلت کا احساس تھا! اسلئے چوراہے پر اسکورو کنے ٹوکنے والے ٹریفک پولیس افسر نے اسکا چالان یا جرمانہ کیئے بغیر، اپنے انسانی فرائض کی آڑ میں بیمار ماں اور اسکی بیٹی دونوں کو، سرکاری جیپ میں بٹھا کر اسپتال پہنچنے میں مدد کی! پولیس افسر پر اپنی نگاہیں جمی رکھنے والے انسانی حقوق کے ایک خود ساختہ ترجمان نے اپنے موبائل پر واقعے کا ویڈیو دکھا کر سرکاری ملازم پر فرقہ پرستی کا الزام لگا ایک ہنگامہ برپا کر دیا! اور پولیس افسر کو سخت جوابی کاروائی کیلئے اکساتے ہوئے غصے سے طنزاً سوال پوچھتا رہا! اپنوں پر کرم اور عوام پر ستم کرنے والے سرکاری افسر! میں تمہارے سیاسی

ارادوں کو ننگا کرنے جارہا ہوں! تم نے اپنوں کی ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کو غفلت کا نام دے کر انکو جزا سے نوازا ہے! اور ہمارے قدم سے قدم ملا کر سڑک پر چلنے کو جرم کا نام دے کر سزا دینے کا جال بچھا کر ہمارے پرامن مظاہروں کو روک دیا ہے! ہمارے دھرنیکو روکنا چاہتے ہو؟ اپنے آئینی حقوق کی آڑ میں آئینی قوانین کے خلاف بغاوت کو نظریاتی اختلاف کا نام دے کر آئینی سرکار کی مخالفت کرنے کے عادی، آس پاس موجود تماشیوں کا خود ساختہ ترجمان، اپنایئت کا احساس دلا کر انکو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ شہر میں چار سے زیادہ لوگوں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والوں پر قانوناً پابندی لگانا فایدے مند عوامی ضرورت نہیں بلکہ آمرانہ طریقوں سے چلائی جارہی جمہوری حکومت کی اپنے خلاف اٹھ رہی عوام کی آواز کو دبانے کی سازش ہے! میرا ٹویٹ سازش کو سرانجام دینے والے سیاست کرنے والے افسر کو بے نقاب کر چکا ہے! میں اسکے فوری طور پر معطل کرنے اور سیاسی قوانین کو ہٹانے کیلیئے دھرنے کی اطلاع ٹویٹ کرر ہا ہوں!

ذی ہوش چشم دید گواہوں کو چکّا جام ریل روکو ہڑتالوں، اور دھرنوں کی سااست کرنے والوں کے ایک جیسے ٹویٹ دیکھ کر تعجب ہوا مگر ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کے کنٹینوں میں، ہوٹلوں کے آرام دہ کمروں اور بیرونی ممالک میں عالمی تنظیموں کے عالیشان دفاتر میں بیٹھے مفکروں صحافیوں قانون دانوں اور عوام سے الگ تھلگ ہو چکے سیاست دانوں کے ایک جیسے ٹویٹ نے واقعے کو سنسنی خیز عالمی اہمیت دلا دی! اور وہ اپنی مخصوص سیاسی بناوٹ کی من چاہی سجاوٹ سے زمینی حقیقت کو عیاں کرنے کا دعوی کرتے رہے! اور غیر جانبدار چشم دید گواہوں کے بیاں انکی بناوٹی دکھاوٹ کو سراب کا عنوان دیتے رہے!



کوئی تو بتا دے

عقاب سے نظر بچا کر اور آس پاس تاک میں بیٹھے مار خور شکاریوں کو ٹال کر گندم کی پک چکی فصل سے ایک خوشہ اٹھا کر سفید کبوتر اپنا آشیانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ قدیم مکان کے دریچوں سے جھانک جھانک کو اپنی حفاظت کرنیوالے اشرف المخلوق کو اشتیاک سے دیکھ کر انکی باتیں سنتا رہا۔

اپنوں سے ارادتاً الگ ہو کر اپنے گھر میں تنہا رہ کر مقصد ان اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی جان بچانے کی خاطر 'کرونا وایرس' کے خلاف ایک جنگ لڑنے والوں کے حوصلے بلند تھے۔

اکیس دن کی جنگ کے دوراں غیر متوقہ واقعات سے ابھرے ہویے سنگین حالات کا سامنا کرتے ہویے رنگین انجام کے منتظر اپنی مثالی جنگ کو ثمر آفرین نطایج کی خاطر بیس دن اور جاری رکھنے والے مکیں کو دیکھکر سفید کبوتر اپنے پر پھڑ پھڑانے لگا۔ مگر اچانک انکے ارد گرد انکا خون چوس کر انکے آہنی ارادوں پر زنگ لگانے والے مچھروں کی سرگوشیاں سن کر وہ سکتے میں آ کر مکیں کے انجام سے لرز اٹھا۔

اعتماد سے اپنی جنگ جاری رکھنے والوں کا تسلسل توڑنے کی خاطر ایک ایک کر کے مکان میں گھس کر مکیں کو چہروں سے پاوں تک ڈنک مار مار کر انکو جسمانی درد کی شدّت کا احساس دلا کر انکو گھر چھوڑ کر سڑکوں پر لا کر انکی ایک جیتی ہویی جنگ کو ہار میں بدلنے کی سازش کا خلاصہ وہ اپنی فتح کا جشن منانے والے مچھروں کی زبانی سن چکا ہے۔

وہ اگر ایک طوطہ ہوتا تو مچھروں کی خفیہ گفتگو رٹ کر اپنے محافظ کو سنا کر، 'کرونا وایرس'

کے خلاف اشرف المخلوق کی جنگ کو روکنے والوں کو بے نقاب کر دیتا۔ بے بس ہو کر اپنی چونچ میں گندم کے خوشے کو مظبوتی سے پکڑ کر اور مکیں کو ملتجی نظروں سے دیکھ کر اسکے انجام سے لرز کر سفید کبوتر سوچ رہا ہے کہ آخر کون ہے وہ جو ایسے زہریلے مچھروں کی پرورش کرر ہے ہیں۔۔۔!

کوئی تو بتا دے؟



ہوک!

کرونا وایرس سے جڑے خدشات سے ابھری منفی سوچ وسمجھ پر حاوی ہونے کی خاطر میں کرشماتی لیپ ٹاپ کا استعمال کرتا رہتا ہوں! سحر سے گئی رات تک گوگل، ای میل اور فیس بک پر تواریخی، تخلیقی اور سوانحی کہانیاں پڑھنے کے ساتھ ساتھ، سوالات و جوابات سے تازہ ترین حالات سے جڑ جانے کا عادی ہو چکا ہوں! مگر آج ایک دوست کا پیغام پڑھ کر سکتے میں آچکا ہوں! اسنے اپنے دوستوں سے ایک سوال پوچھا ہے! کوئی تو اسکو یہ بتادے کہ وہ اپنی تین برس کی بھتیجی کو کیسے یہ بتادے کہ اسکے والدین دونوں کرونا کے شکار ہو چکے ہیں! میں اپنے دوست کو کیسے بتادوں کہ میرے ٹوٹ چکے دل

سے اٹھی ہوک میرے لرزرہے الفاظ کو دبوچ چکی ہے!!



رنگ

یہ کل رات کی بات تھی۔ تب ہال میں رنگ جگمگا رہے تھے اور خوشبو بکھیر رہے تھے!
ایسا پہلی بار ہوا تھا جب ایک کامیاب فیشن شو کے رسمی اختتام کے بعد اچانک شو پھر سے شروع ہوا تھا۔یعنی جب جگمگاتی رنگ برنگی روشنیوں میں فیشن شو میں حصہ لینے والی مشہور و معروف ماڈل لڑکیاں مختلف جانے پہچانے فیشن ڈیزائنرز کی تخلیق کی گئیں پوشاکیں پہن کر اسٹیج پر الوداعی تقریب میں ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں تب اچانک ہال کے کسی کونے میں بیٹھا ایک بے نام شخص اپنی بیہودہ دراندازی کو سختی سے روک دیتے مگر ایک سحر انگیز جسم پر ایک حیرت انگیز پوشاک دیکھ کر یوں لگ رہا تھا گویا کسی مصور کی غیر فانی تصویر کینوس چھوڑ کر اسٹیج پر خود چل آئی تھی!اور جو شخص اس کو انگلی پکڑ کر لایا تھا وہ خود ایک اپنے تراشے ہوئے بت کو دیکھ کر سوچ رہا ہو کہ کیا اُس کا یہ مجسمہ انارکلی کی طرح کسی شہزادے کے تیر چلانے کے بعد اپنے دل کی بات کر سکے گی؟ بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک تخلیق کار کی آرزو پوری ہوگی یا اُس کی آرزو اِس بار بھی حسرت میں بدل جائے گی؟ لیکن اِس بار ویسا ہی ہوا تھا جیسا اُس نے سوچا تھا۔لڑکی کو دیکھ کر اسٹیج پر موجود تمام ماڈل لڑکیاں خود ہی پیچھے ہٹ کر ستاروں کی طرح چاند کو دیکھ رہی تھیں جب کہ ناظرین کی نگاہیں خالق اور تخلیق پر جمی ہوئی تھیں اور یوں دونوں شو پر چھا گئے تھے بلکہ جج حضرات کی خاص توجہ کا مرکز بھی بن گئے تھے۔ایک مہمانِ خصوصی نے بلا جھجک جب یہ کہہ دیا کہ جیسے ستار کی مدد سے پنڈت روی شنکر نے برسوں پہلے مشرق کو مغرب سے ملا دیا تھا ویسے اِس قابلِ فخر آدمی نے آج مغرب کو مشرق سے ملا دیا ہے اور وہ بھی پوشاک کی مدد سے!

یہ جملہ سن کر گویا ایک دروازہ کھل گیا اور قصیدے ہال میں داخل ہو کر اُس کے احساسات کا تعاقب کرتے رہے اور سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہے۔ جواب نہ ملنے پر اُس کی بے رُخی کو ایک کامیاب انسان کی ادا سمجھ کر خود ہی سوال کرتے رہے اور خود ہی جواب دیتے ہوئے اُس کے قریب سے گزر کر اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے رہے۔!

کبھی خوابوں کی باتیں، کبھی تصورات کی باتیں، کبھی الہام کی باتیں، کبھی تقدیر کی باتیں، کبھی تدبیر کی باتیں اور کبھی اُکسانے کی خاطر اتفاق کی باتیں، یعنی کبھی فنکار کے بارے میں باتیں اور کبھی شاہکار کے بارے میں باتیں! جب کہ وہ خود اپنا سایہ ڈھونڈ رہا تھا جو اُس کو جگمگاتی روشنیوں میں کیسے مل جاتا۔؟

پچھلے دس سال سے وہ اپنے سائے سے بہت پیار کرنے لگا ہے نا؟ اس لئے! جبھی تو وہ نہ چڑھتے سورج کو دیکھنا چاہتا ہے اور نہ ڈوبتے آفتاب کو دیکھنے کا عادی ہے۔ ہاں اگر اپنی پیٹھ سورج کی طرف کر کے وہ ہر صبح اور شام ہونے سے پہلے اپنا لمبا سایہ دیکھ کر اپنے شکستہ دل کو تسلیاں دیا کرتا ہے یہ سوچ کر کہ میں بھی قد آور ہوں۔! اور پھر سوچتا رہتا تھا کہ اگر خواب دبی خواہشات کا عکس ہوتے ہیں تو کی تعبیر تصوارت کی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔؟ اور اگر خواب الہام کی عکاسی کرتے ہیں تو میں جب اپنے جوانی میں ہی سفید بالوں کو خواب میں کالے ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں تو میری زندگی میں بہار کیوں نہیں آتی ہے؟ ایسی باتیں وہ اس لئے سوچتا رہتا ہے کیوں کہ اُس نے ٹالسٹائی کی کہانی میں پڑھ لیا ہے کہ ایک بیوی نے خواب میں اپنے شوہر کے کالے بالوں کو سفید ہوتے ہوئے دیکھ کر، خواب کو الہام سمجھ کو سفر پر جانے سے روکا تھا۔ مگر چوں کہ خواب کو ایک منظر سمجھتا تھا جو بند پلکوں میں کبھی ہنساتا ہے، کبھی رُلاتا ہے اور کبھی ڈراتا ہے، وہ سفر پر نکل پڑتا ہے۔ پھر ایک جھوٹے قتل کیس کا مجرم بن کر سزا کاٹ لیتا ہے۔

آج اپنی شہرت دیکھ کر تذبذب میں ہے کہ کیا اُس کو سچ مچ کامیابی کا الہام مل چکا تھا؟ یا اُس کو اس کے تصور نے ایک شاہکار پیش کرنے کا موقع بخش دیا ہے؟ کیا اُس کی پیشکش واقعی ایک شاہکار ہے؟ اُس کا دن سوچتے سوچتے گزر چکا ہے اور یہ آج شام کی بات ہے! آرٹ، کلچر اور فیشن کو بھی فنون لطیفہ کا ایک قابل قدر جز سمجھنے والے تحقیق کاروں، تنقید نگاروں، آرٹ کے

قدردانوں، جانے مانے میڈیا کے نمائندوں اور معاشرے کی شان بڑھانے والوں نے اُس کے اعزاز میں ایک عالی شان استقبالیہ کا اہتمام کیا ہے اس لئے وہ مہمان خصوصی ہونے کی وجہ سے ہر نگاہ اور ہر کیمرے کی آنکھ اُس کے چہرے پر مرکوز ہے۔ میڈیا والے اُس سے سوالات پوچھ لیتے ہیں تو بے تکے جواب دے کر اُن کو چونکا دیتا ہے۔

ایک صحافی نے جب اُس سے کچھ اپنے بارے میں کہنے کی گزارش کی تو وہ بولتا رہا گویا ایک نیم خالی ٹیوب سے دبا دبا کر تھوڑا تھوڑا ٹوتھ پیسٹ نکال رہا ہو۔

میرے والدین نے جو نام مجھے دیا تھا اُس کا لفظی معنی 'طاقتور' ہوتا ہے لیکن چوں کہ میں جسمانی طور پر کمزور ہوں اس لئے میں نے اپنے آپ کو ایک بھاری بوجھ سے الگ کر دیا۔ بھوک نے میرا اپنا بوجھ بھی ہلکا کر دیا تو میں ایک شاخ سے الگ ہوئے پتے کی طرح اُڑتا اس شہر میں پہنچا۔ قسمت دیکھنے والے طوطے نے فال نکالا تو اُس کی تحریر پڑھ کر میں اتنا جان گیا کہ ایک دن میں اپنی ایک سحر انگیز شاہکار سے دنیا کو چونکا دوں گا۔ تب میں نے 'ساحر' نام اپنا لیا۔ ساحر شاید اپنے بارے میں ایسی نجی باتیں چھپا لیتا مگر دس سال ایک نامور سنیماٹوگرافر کے اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے وہ یہ جانتا ہے کہ ایک کامیاب انسان اگر یہ کہہ دے کر اُس نے اپنی ماں کی ساڑی ایک کباڑی کو فقط ایک فلم دیکھنے کے ٹکٹ کے عوض بیچ ڈالی تھی تب پریس والے ایک عجیب کو جنون کا نام دے دیتے ہیں جبکہ ایک غریب کو اپنی بیوی کے علاج کے لئے اپنی کمبل بیچ ڈالے تو اس کو چور کہہ کر پولیس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ زندگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو ساحر نے مرحوم چارلی چیپلن کا حوالہ دے کر کہا کہ اگر ایک برف کا ٹکڑا شرارتاً ایک امیر عورت کے کپڑوں میں ڈالا جائے تو ایک کامیڈی جنم لیتی ہے۔ مگر یہی عمل کسی غریب عورت کے ساتھ کی جائے تو ٹریجڈی کی نمائش ہوا کرتی ہے۔ اور یہی زندگی کے دو رنگ ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ساحر کا سحر محفل پر یوں سوار ہو گیا کہ سوالات کرنے والے یہ بھول گئے کہ وہ ایک ڈریس ڈیزائنر کے استقبالیہ میں شرکت کرنے آئے ہیں۔

مختلف سماجی، سیاسی، ثقافتی موضوعات کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے بے تکے جوابات سن کر سبھی ساحر کے لفظ لفظ اور ہر جملے کو اپنی کہانیوں کو سنسنی خیز بنانے کی خاطر کو امر

کرتے رہے۔ ساحر ایک دانشور ہے۔! ساحر ایک فلسفی ہے! ساحر ایک اشرف المخلوق ہے!

یہ تاثرات پر کیف ہوا کے جھونکوں کی طرح ہال میں گھومتے رہے۔ نامور ڈریس ڈیزائنرز اور اُن کے ساتھ آئی ہوئی ماڈل لڑکیاں زرق برق پوشاکیں پہنے ہوئے اپنی مخصوص ادائیں دکھا دکھا کر بھی حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہو گئیں تو وہ بطور احتجاج جانے ہی والی تھیں جب ایک سرگوشی نے ہوا کے جھونکوں کو گویا روک دیا۔ ماحول میں اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی اور ساحر سے اپنے اردگرد لوگوں نے سخت لہجے میں اُس کی ماڈل لڑکی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنا شروع کر دیا۔

کچھ لوگ گویا گہری نیند سے جاگ کر بڑبڑانے لگے۔ ارے یہ میڈیا والے نہ ہوں تو اصلی بات نقلی باتوں کے تودوں کے نیچے دب کر رہ جائیں گی۔! کمال ہے جس ڈریس اور ماڈل گرل کی وجہ سے ایک گمنام مصور راتوں رات اتنی شہرت اور عزت ہم لوگوں سے حاصل کر چکا ہے وہ آج کہیں نظر نہیں آ رہی ہے؟ کیوں؟ کیوں؟۔ کہیں وہی اصلی تخلیق کار تو نہیں ہے۔؟ کمال ہے؟ کسی کے ناول کو اپنا بتا کر انعامات و اعزازات حاصل کرتے تو سنا ہے، کیا ہمارے فیلڈ میں بھی ایسے شاطر لوگ گھس آئے ہیں؟

ارے جادوگر تماشہ دکھا گیا اور ہم سمجھ بیٹھے کہ ہمارے سامنے حقیقت ہے۔!

یہ کوئی نیا گو گیا پاشا تو نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کہتا کیوں نہیں؟ تب شاید ساری دنیا میں مشہور ہو جاتی؟ کیوں نا پوچھ لیا جائے ساحر سے کہ تمہاری ماڈل کہاں ہے؟ لیکن وہ سیدھے سوالات کے اُلٹے جوابات دیتا رہتا ہے۔ ستاروں کے بارے میں پوچھو تو جواب پہاڑوں کے حوالے سے دے کر ہم سب کو لاجواب کر دیتا ہے۔ پھر بھی پوچھ ہی لیا جائے تو بہتر!

اس سے پہلے کہ دانشور دانشمندی سے ساحر سے سوالات کرتے چند بے باک ٹی وی رپورٹروں نے ساحر کو اپنی ماڈل کے بارے میں کھل کر باتیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ چند روز پہلے ساحر ایک سڑک چھاپ ڈھابے پر کھانا کھا رہا تھا جب اُس نے سڑک کنارے ایک درخت نیچے بیٹھی عورت کو اپنے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسے منظر وہ روز کہیں نہ کہیں دیکھا کرتا تھا مگر اس بار یہ منظر قابل دلچسپی اس لئے بنا تھا کیوں کہ عورت ایک سوکھی روٹی

کا ٹکڑا کاٹ کر پہلے ڈھابے کی طرف دیکھ کر یوں ظاہر کرتی تھی گویا دل کے پتیلے میں روٹی کے ٹکڑے کو ڈال کر مزے لے لے کر کھالیا کرتی تھی۔!

یہ منظر ڈھابے کا بوڑھا مالک بھی ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا۔ ساحر سمجھ گیا تھا کہ بوڑھا عورت کے نیم عریاں پستانوں کو دیکھ رہا ہوگا، لیکن بات کچھ اور تھی۔ بوڑھ سڑک پار کر کے جب عورت کے سامنے کھڑا ہو کر جانے کیا کہہ رہا تھا جس کو سن کر عورت قہقہے لگاتی جا رہی تھی۔ اچانک جب بوڑھا جوان عورت سے جھگڑنے لگا تب ساحر بھی سڑک پار کر کے بوڑھ اور بے حد خوبصورت عورت کے درمیان کھڑے ہو کر دونوں کی باتیں سن کر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ جھگڑا اس بات پر ہو رہا تھا کہ بوڑھا عورت سے دال کے پیسے مانگ رہا تھا اور عورت جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی کھول کر جھوٹ موٹ بوڑھے کے ہاتھ میں پیسے تھما کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی اور یوں بوڑھا بار بار بھڑک کر اب غصے سے چلانے لگا تھا۔ جواباً عورت یہ کہہ رہی تھی کہ جیسے میں نے تمہاری دال کھالی ہے ویسے ہی پیسے دے رہی ہوں۔ عورت اس کے بعد گھبرا گئی تھی اس لئے ساحر اُس کو اُس اینٹ کے بھٹے پر لے گیا تھا جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ کام کرتی تھی۔

مشکلا اٹھارہ سال کی یہ خوبصورت عورت اپنے ایک ماہ کے بچے کو پولیو ڈراپس پلانے کی خاطر اُس کو اسپتال لے گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عورت کی نگاہیں مرد کے ارادوں کو بھانپ لیتی ہیں اس لئے دو اجنبی دو دوست بن گئے تھے۔

اُس رات ساحر سو نہیں پایا تھا۔ بار بار اُس کے سامنے اس عورت کا چہرہ سامنے آجایا کرتا تھا۔ اُس کا پریوں جیسا بدن، الجھے ہوئے بال جو آج کل کے فیشن کے حساب سے سلجھے ہوئے بلکہ کسی نامور ہیئر ڈریسر کے سجائے ہوئے نظر آرہے تھے، وہ مسکرا دیتی تھی تو دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھتے تھے جبکہ اُس کے گالوں پر ایک سیب کی طرح لالی ابھر کر آیا کرتی تھی اور پھر وہ شرما کر اُس کا چہرہ ایک مکمل طور پر لال رنگ کے سیب کی مانند نظر آیا کرتا تھا۔ اُس کے جسم سے گیلی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔ اُس نے بے ڈھنگے کپڑے پہن لیے تھے مگر ایک مصور کی نظر میں وہ ایک بے نظیر کولاج کی طرح نظر آرہی تھی۔ ایک مردانہ مگر بہت بڑے سائز کی قیمتی قمیص جس میں کئی چھید تھے اور ایک بازو ہی نہیں تھا، قمیص میں ایک بھی بٹن نہیں تھا اس لئے جب وہ

اپنے بچے کو سینے سے الگ کردیتی تھی تب اُس کے بے قابو پستان دیکھنے والوں پر گویا بجلی گرا دیتے تھے۔! اپنی بے حد خوبصورت ٹانگوں کو اُس نے ایک چھوٹے سائز کی ایک پھٹی پرانی اسکرٹ سے چھپانے کی کوشش تو کی تھی مگر اُس کے لمبے قد کی وجہ سے وہ اُن دریچوں، کھلی کھڑکیوں اور کھلے دروازوں سے اُس کے جسم کی خوبصورتی جھانک کر دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

ساحر نے اتنا کہہ دیا تو ہوا کا رُخ پھر بدل کر یہ سرگوشیاں اپنے ساتھ لیتا گیا کہ ساحر نے کسی جیتی جاگتی مورت سے متاثر ہو کر اپنی تخلیق کی صورت بنا دی ہے یا پھر اُس کے تصورات کی پرچھائیں جیتی جاگتی تصویر بن کر ناظرین کے سامنے آئی ہے۔!

ایک دانشور نے باآواز بلند کہا کہ ساحر نے جو بھی کہا اُس نے مجھے پر جادو کر دیا ہے۔ لوگ تحریروں میں تصویریں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں جب کہ مجھے اس جادوگر کی تقریر میں ایک پرکشش تصویر نظر آ رہی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کل ساحر کی ماڈل کو دیکھا تھا یا نہیں مگر آج اُس کو سن کر دیکھ رہا ہوں آنکھیں بند کر کے۔! مگر ساحر نے جب وہیں سے اپنا کلام جاری رکھا جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا، ہوا کے رُخ بدلنے کی وجہ سے! اُس نے کہا کہ وہ کئی دنوں سے فیشن شو دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اور وہ جو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا رہا تھا وہ دکھاوٹ کے لئے ایک بناوٹ ہے۔ نمائش کے لئے سجاوٹ ہے۔ اور فن کے تاجروں کی خوشحالی کی آہٹ ہے! تب وہ اُس عورت کو اپنے ساتھ یہ کہہ کر لایا تھا کہ وہ اُس کے بچے کے لئے بہت سارے نئے کپڑے لائے گا، امیروں کے بچوں کے پھینکے ہوئے پرانے کپڑے نہیں۔! وہ فوراً مان گئی اور ساحر اُس کو اسٹیج پر لے گیا تھا۔ جب اُس کے حریفوں نے ماڈل کو پھر استقبالیہ تقریب میں لانے کی ضد پر اڑے رہے تب ساحر چند لمحات کے لئے ہال میں موجود لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر وہ جب لوٹ کر آیا تو اُس کے ساتھ ایک بچہ گود میں لئے ایک ماں تھی۔!

ناظرین نے عورت کی آمد کو نظر انداز کر کے ساحر سے اُس کی ماڈل کے بارے میں تلخی اور طنز کے ملے جلے تاثرات سے پوچھ تاچھ کی تو وہ بوکھلا کر بول پڑا کہ سونے کے سکے ڈھونڈنے والوں کو اگر سیپ میں اپنا من پسند اور بکاؤ موتی دکھنا ہے تو دیکھ لو۔! یہ کہہ کر ساحر نے جب ایک

ماں کے سینے کے ساتھ لپٹ کر ہو رہے بچے کو الگ کر دیا تو وہ ایک بے حد خوبصورت لڑکی اُسی لباس میں نظر آئی جیسے ناظرین نے اُس کو کل رات اسٹیج کی جگمگاتی روشنی میں دیکھا تھا یعنی لال رنگ کی ایک بڑے سائز کی قمیص، جس کا ایک بازو نہیں ہے جس میں کئی چھید ہیں، جس کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں اور قمیص کے نیچے ایک بریزری نہ ہونے کی وجہ سے دو پھڑ پھڑاتے ہوئے سفید کبوتر باہر آ کر شکاریوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تو قدردان اور قدرتی خوبصورتی پر مہربان ہونے والے ڈریس ڈیزائنرز قریب آ کر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ اور اپنی تخلیقی زاویوں سے ایک سحر انگیز ماڈل کو دیکھتے رہے تو عورت گھبرا کر اپنے نیم عریاں جسم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرتی رہی تو ناظرین ان حرکتوں کو ماڈل کی ادائیں سمجھ کر مسکرا تیر ہے! حالانکہ عورت کے جسم سے کچھ مٹی کی بو آ رہی تھی لیکن اُس کے گرد عورتوں نے جو عطر لگا دی تھی اس سے چار سو خوشبو نے قریب کھڑے نامور لوگوں کو بھی ناک بند کر کے دور دور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ساحر کو پیچھے دھکیل کر مشہور و معروف ڈریس ڈیزائنر خود ایک ماڈل گرل سے انگریزی، ہندی، اردو اور تمام علاقائی زبانوں میں پوچھ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ کام کر لو تو منہ مانگی رقم دینے کے علاوہ بین الاقوامی شہرت دلا دیں گے۔ ہال میں موجود کئی ماڈل لڑکیوں کے منہ لٹک گئے تو وہ ایک ہی جگہ یوں کھڑی تھیں گویا حملے کی تیاری کرنے لگی تھیں! اچانک ایک بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز نے گویا سائرن بجا دیا ہے۔!

عورت اپنے گرد مداحوں کی محیط توڑ کر ساحر کو ڈھونڈ کر اپنے بچے کو سینے سے لگا کر لرز رہی آواز میں بول پڑی۔

بھیا! میرے بچے کو نہ اچھے کپڑوں کی ضرورت ہے اور نہ کھلونوں کی! اِس کو بھوک لگی ہے۔ میں اِس کو دودھ پلا دوں گی۔ یہ کہہ کر وہ جب ایک کونے میں بچے کو دودھ پلانے لگی تب وہ ساحر سے ناراض ہو کر کہتی رہی۔

یہ سب جو مجھ سے پوچھ رہے تھے میں سمجھ تو رہی تھی، مگر مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ میرے شوہر، میرے دیور اور میرے ساس سسر کو بھی کام دیں گے؟ بھیا! آپ نے اِن لوگوں کو بتا دیا ہے نا کے بغیر ایک دن باہر جاتے ہیں تو اپنے کسی کو گروی رکھ کر! میں نے اپنے شوہر کو——

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی یا ساحر کچھ اور سنتا ایک خوبصورت ماڈل نے اپنائیت کی آڑ میں اپنی چالاکی سے بات جان کر یہ کہہ دیا کہ ایک عام غریب لڑکی کے کپڑوں کو ایک فریبی نے اپنی انوکھی تخلیق بتا کر فیشن کی دنیا کو داغدار بنا دیا ہے۔ ماڈلز کو رسوا کر دیا ہے اور فیشن ڈیزائنرز کو تخلیق کار کی بجائے لوگوں کو بے وقوف بنانے والے جعل ساز ثابت کر دیا ہے۔ کریٹیوٹی (Creativity) کو یکری (Quackry) ثابت کر دیا ہے ایک ناکامیاب اور گمنام نام نہاد تخلیق کار نے۔!

اور ہم واقعی بے وقوف بن گئے ہیں۔ ایک بے نام کو نام دے کر! عزت دے کر، شہرت دے کر!

اِس گرم ہوا سے حریفوں کے غصے کی اُبال جب ساحر پر گر جاتی تو اُس نے چارلی چیپلن کی بات دہرائی۔ اگر برف کا ایک ٹکڑا کسی امیر عورت کے قیمتی قمیص میں شرارتاً میں مذاقاً ڈالی جائے تو ٹریجڈی ہو جاتی ہے۔

دیکھنے والوں میں کچھ کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔! اور کچھ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے ہیں و۔! ایک ماڈل اسٹیج پر عریانیت کا مظاہرہ کرتی ہے تو اُس کی پوشاک کو معاشرہ فخر سے قبول کرتا ہے۔ اور جب ایک غریب عورت کو تن ڈھانپنے کے لئے حسبِ ضرورت کپڑا نہیں ملتا ہے وہ نمائش کی تصویر بن جانے کی بجائے ایک بدبختی کی تصویر بن کر رہ جاتی ہے اور یوں مصنوعی رنگ اصلی رنگوں سے جلوے چرا کر اُن ہی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کل ایک ناکامیاب مصور اپنے رنگ، اپنے برش، اپنی مہاگنی پلیٹ یا اپنی کوئی شاہکار پینٹنگ لے کر ایک جگمگا رہی نمائش گاہ میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایک جیتی جاگتی ایک عورت کو لے آیا تھا تاکہ کوئی مسیحا اُس کے ننگے بدن کو ڈھانپنے کے لئے ایک لبادہ بنا سکے مگر وہ آج اپنے پیچھے ایک سحر انگیز تاثر چھوڑنے کی بجائے ایک سحر انگیز رنگ برنگی ماحول چھوڑ کر اُن تاریکیوں میں واپس لوٹا ہے جہاں رنگ نظر ہی نہیں آتے! مگر اُس کے ساتھ ایک ماں ہے، ماں کے سینے سے لپٹا ہوا ایک بچہ ہے اور چار سو پھیلی کچی مٹی کی مہک بھی ہے!!



آغا صاحب کا بنگلہ

ملک کے بٹوارے سے پہلے بزرگ لوگ شہر سے دور جھیل کے کنارے پر واقع مغل باغات کی طرح اونچی فصیلوں کے درمیان دور دور تک پھیلے گلستاں اور دھان کے کھیتوں کی گود میں آغا صاحب کے بنگلے کا یوں ذکر کیا کرتے تھے گویا کسی طلسمی محل کا آنکھوں دیکھا حال بتایا کرتے تھے۔

پھر حالات بدلتے رہے مگر کروڑوں کی آبادی والے برصغیر میں نہ سہی ہمارے لاکھوں کی آبادی والے شہر میں شاید ہی کوئی گھر ہوگا جہاں بنگلے کی تواریخ کے بارے میں تو نہیں البتہ جغرافیے کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی تجسس کی خاطر اور کبھی کرید کی خاطر!

کہا جاتا ہے کہ آغا صاحب ایک خاندانی رئیس تھے۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کی سوچ میں مغربیت تھی، دل میں مشرقیت کی بیلیں۔ دماغ میں جا کر ان کو اپنا آبائی شہر سے بہت پیارے تھا اس لئے انہوں نے اپنے ایک فن تعمیرات کے ماہر انگریز دوست کی ذاتی نگرانی میں ایک ایسا بنگلہ بنوالیا تھا جس کے بارے میں ان کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ عمارت میں کتنے کمرے ہیں۔ کون سا دروازہ کھول کر چند سیڑھیاں چڑھ کر یا اتر کر کس ہال میں پہنچا جاتا ہے۔ میں ان کا انگریز سکریٹری اُن کو بتا دیا کرتا تھا کہ ان کو کس سماجی، سیاسی، ثقافتی، موج مستی یا مذہبی جلسے میں مہمان خصوصی بن کر جانا ہے۔

آغا صاحب کو سنگیت سے بہت لگاؤ تھا اس لئے اکثر گئی رات تک گراموفون پر غزلیں سنا کرتے تھے۔ صرف اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر کبھی کبھی دلربا کو گود میں لے کر خود بھی

گا لیا کرتے تھے۔ ملے کشی گاتے وقت کیا کرتے تھے البتہ شکار کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اکثر اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ شکار گاہوں میں روپے پانی کی طرح بہایا کرتے تھے۔ اور ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اثاثے ،گلیشر وں کے مانند پانی کے جھرنے بہاتے رہتے تھے گویا ایک سال کی آمدنی پانچ سال کے اخراجات برداشت کرتے رہتے تھے۔ ہاں وہ ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ عطا کر کے یا چندے دے کر۔! حاسد لوگ کہا کرتے تھے کہ خدا نے نمک کا پہاڑ دیا ہے۔ کاٹتے رہو پھر بھی پہاڑ اقتصادی پاسبان بھی رہے گا اور حفاظت کے لئے سنتری بھی ہوگا۔ پشت در پشت۔! خود ایک غریب لڑکی سے شادی کر چکا تھا مگر جس اکلوتی اولاد کو اس نے بورڈنگ اسکول میں ڈال کر مشکلا لندن اسکول آف اکنامکس (London School of Economics) پہنچایا تھا وہ ادھوری تعلیم کے بعد لندن میں پلی بڑھی ایک پری چہرہ ہم وطن کو بیاہ کر کے آغا صاحب کے بنگلے میں لے آیا تھا۔عیش وعشرت کی بے خوف زندگی گزارنے کی خاطر۔ آغا صاحب کو اپنی بہو کی معیوب حرکتیں نا گوار گزرتی تھیں مگر چوں کہ شوہر کو بیہودگیوں میں ادائیں نظر آیا کرتی تھیں اس لئے آغا صاحب کی مغربی سوچ بھی اعتراضات کرنے کی بجائے اپنے مشرقی خیالات، جذبات بلکہ خدشات کو دل میں ہی دباتے رہے۔ پھر حاسدوں نے بدچلنی کے الزامات لگائے جب کہ گھر کے بے شمار نوکر چاکر یہ افواہیں پھیلاتے رہے کہ پری چہرہ عورت پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے اور جب بھی وہ عریاں ہو کر کسی کونے میں دُبک کر بیٹھ جاتی ہے اس وقت جن اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ آغا صاحب کا بیٹا جب اچانک دو جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد بینک سے بہت بڑی رقم نکال کر فرار ہوا تب آغا صاحب کو ہر طرف سے خطرے کے سائرن سنائی دیے تو اس نے لندن سے ایک ڈاکٹر کو بلایا تا کہ وہ خفیہ طور پر یہ کہہ سکے کہ اُس کے پوتوں میں اس کے بیٹے کا خون ہے یا نہیں کیوں کہ ان کو بھی بہو کے چال چلن پر شک ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے جانچ کرنے کے بعد آغا صاحب کو بتایا کہ ان کی بہو ایک قسم کے پاگل پن کی شکار ہے جس کو انگریزی میں سیزوفرینیا (Schizophrenia) کہتے ہیں اور جو میڈیکل بیماری سے جانا جاتا ہے۔ یہ بیماری جینیٹک (Genetic) یعنی ماں یا باپ کے خون کے ذریعہ اپنا شکار تلاش کرتی ہے یا یہ پاگل پن رنگ ڈھنگ، برتاؤ، عمل بدلتا ہے۔ کبھی

بیمار اپنی شدھ بدھ کھو کر یا تو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہتے ہیں یا پھر کسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور اس عمل کے دوران وہ نہ سوتے ہیں اور نہ کوئی اور کام کرتے ہیں۔ روکو ٹوکو تو حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی چلنا چاہے تو وہ چلتا رہتا ہے۔ کوئی گانا پسند آئے تو دن رات وہی سنتے رہتے ہیں۔

بیماری لاعلاج ہے مگر دورے کا وقفہ کبھی کم ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا لمبا کہ عمر کٹ جاتی ہے۔ دو واسٹروکس کے درمیان کبھی اتنا لمبا وقفہ ہوتا ہے کہ لگتا ہے بیمار ٹھیک ہو چکا تھا۔ لیکن بیماری جاری رہتی ہے۔ یہ خبر سن کر آغا صاحب گر کر اٹھے نہیں مگر سسر کی لاش دیکھ کر بہو چیخ پڑی اور ٹھیک ہو گئی! اس کا بڑا بیٹا پڑھائی میں اچھا تھا اس لئے اپنے دادا کا حوالہ دے کر لندن میں اُسی خاندان میں پہنچا جس کے ایک بزرگ نے اس کے دادا کا بنگلہ بنا ڈالا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس چھوڑ کر ایک لڑکی سے اس قدر والہانہ پیار کر بیٹھا کر اس کا دُم چھلا بن گیا اور وہ ماں کو بھول ہی گیا۔ لڑکی تھی تو ایک خوبصورت صحافی مگر دماغ سے ایک شاطر سیاست داں۔ دونوں نے شادی کی اور سال میں ایک بار دونوں ماں سے ملنے کے بہانے اپنے حصے کی دولت لے کر اور بنگلے کی یادیں کیمرے میں قید کر کے چلے جایا کرتے تھے جب کہ دوسرا بیٹا اکثر اپنے دادا کے کمرے میں بیٹھ کر ان کے گراموفون پر بہت ہی پرانے گیت سنتا رہتا تھا۔ کھانا پینا بھول کر، رات رات جاگ جاگ کر، باہر کی دنیا ہی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو کر۔ بیس سال کی عمر ہوئی تو وہ دادا کی طرح رقص و سرور کی محفلیں سجاتا رہا مگر سونی بزم میں صرف سازندے اور رقاصہ ہوا کرتی تھی۔ پھر بند کمرے میں صرف رقاصہ اور وہ ہوتے تھے۔ ماں کو یہ جانکاری بھی نہیں ہوا کرتی تھی کہ بنگلے کے کس کمرے یا ہال میں کیا ہوا کرتا تھا۔ ہاں جب چھوٹے بیٹے نے ایک کتھک رقاصہ سے شادی کی اُس روز بڑے بیٹے اور بہو نے اُس کو ان کی شادی کی اطلاع دی تھی۔ اس خفیہ شادی سے ماں کو ایسا صدمہ پہنچا کہ ان کی سوئی ہوئی بیماری پھر سے جاگ اٹھی جس کی وجہ سے ان کو ایک اذیت نام رات گزارنی پڑی۔ ماں نے بیٹے اور بہو کو سارے بنگلے میں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ آخر کار رات کے آخری پہر میں دونوں کو باغ کے کنارے ایسی حالت میں پایا گویا فلم 'مغل اعظم' میں سلیم اور انارکلی محبت کا اقرار کر رہے ہوں۔ میاں بیوی خوش تھے۔ رقاصہ بیوی کو گانا گانے سے زیادہ اُس وقت خوشی ہوتی تھی جب اُس کی

کلاکاری کوجنون کی حدتک پسند کرنے والاموجود ہواور گانے کے بارے میں سوالات بھی کرے کہ یہ بھیروی راگ ہے نا؟ راگ مال کونش شام کوگائی جاتی ہے نا؟ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرتے تھے۔ کھانالانے والے اورنوکر چاکر آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی یہ نہ جان پائے کہ میاں بیوی دونوں اٹھتے سازوں اور راگوں کی باتیں کرتے ہیں بلکہ شوہر اکثر نواب واجد علی شاہ کی طرح کرشن کے روپ میں راس لیلائیں کرتار ہتا ہے۔ نہ کسی سے ملنا جلنا، نہ اخبار پڑھنا، نہ ٹی وی دیکھنا، یعنی دونقطوں سے جڑی ایک لکیر۔! اور لکیر کے دوسروں پر ایک تماشا اور دوسرا تماشائی۔ تماشہ رقص وسرود کا۔ پھر ایک سال بعد بیٹے کی پیدائش نے لکیر کو ایک تکون بنا ڈالا۔ جس دن بیٹا پیدا ہوا اُسی روز اُس کی دادی کی موت ہوئی۔ یہ قہر خدا کیا ایک اتفاق تھا؟ وہ دن ایک بیوہ کے لئے جان لیوا کیوں ثات ہوا؟ یہ ایک معمہ ہوسکتا تھا اگر گھر کا ایک وفادار کاشتکار نئے منیجر کی من گھڑت کہانی کوثبوت کے ساتھ خارج نہ کردیتا!!

ہوا یوں تھا کہ بیوہ جو اب آغا ہاؤس کی مالکن تھی، نے ایک اجنبی کو ایک پھلدار درخت کو بے دردی سے کاٹتے دیکھ کر جب اُس کو تھپڑ مارنا چاہا تب نئے منیجر نے اس کا ہاتھ روک کر کہہ دیا کہ اس کے بڑے بیٹے کی بیوی نے اُن لوگوں کو خیمہ لگانے کی اجازت دے دی ہے۔ پھر بہو نے پلٹ کر دیکھا تو کچھ پھلدار درخت کاٹے جاچکے تھے اور کچھ کاٹے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ چیخ پڑی تھی اور گر کر اس کی لاش ہی کو اٹھائی گئی تھی۔ انگریزن جٹھانی کے نمائندے نئے منیجر نے چھوٹی مالکن کو صدمے سے ہوئی اس کی ساس کی موت کو خودکشی کا نام دے کر ورثے میں ملی بیماری سیزوفرنیا کا ایک المناک نتیجہ بتا کر آغا صاحب کے چھوٹے پوتے کے انجام سے اس قدر ڈرادیا کہ وہ اپنے بیٹے کے انجام سے بھی لرز اٹھی۔ شوہر کی حالت ایسی تھی کہ وہ بیوی کو گھنگھرو باندھ کر رقص کا سلسلہ وہیں سے شروع کرنے کی ضد پر اڑ کر چیختا چلاتا رہا۔ ماں کی گود سے بچے کو چھین کر وہ بیوی کو گھنگھرو پہنانے کے لئے مجبور کرتا رہا۔ دراصل اس پر بیماری کے تاثرات کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا اور وہ کہاں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

اگر وہ ایک مشرقی خاتون نہ ہوتی تو بیٹے کو ساتھ لے کر بھاگ گئی ہوتی۔ مغربی عورت نے مشرقی عورت کو کئی بار یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ بنگلے کے اپنے حقوق اس کو دے کر پاگل شوہر کو کسی

پاگل خانے میں ڈال کر بیٹے کو لندن میں باقی زندگی گزارے، مگر ایک وفادار بیوی بیمار شوہر کو چھوڑ کر جانے کے لئے زمینی دباؤ کے باوجود آغا صاحب کا بنگلہ چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہوئی۔ اور ایک پاگل کے وحشی پن کے باوجود لہولہان پیروں سے ناچتی رہی۔ انگریزن بہو بنگلے کی مالکن بن گئی تھی اور دیورانی کو اس کو اپنا حصہ اس کے نام کر دینے کے لئے نہایت شیریں زبان میں دباؤ ڈالنے میں جب ناکامیاب ہو کر اپنی حکمت عملی کے تحت واپس لندن آتی جاتی رہتی تھی۔ ہاں مگر ہر بار وہ اپنے چھوٹے دیور دیورانی اور ان کے بیٹے کی آرام دہ زندگی کے پورے پورے انتظامات کرنے کے بعد جایا کرتی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ان کی زندگی ایک ہی بہت بڑے کمرے میں محدود تھی لیکن ان کو من چاہی سہولیات میسر کی جاتی تھیں۔ نہانے کے لئے گرم اور سرد پانی، روز کپڑے بدلنے کا پورا پورا انتظام، من پسند کھانے، میوے وغیرہ چھوٹے آغا صاحب کی بیوی یا ان کا بیٹا کمرے کے باہر رکھ کر دروازہ بند کر کے ایک وقفے کے بعد گویا حکم کی تعمیل کی جاتی تھی۔ دیورانی جٹھانی کی چال بازی سمجھ تو رہی تھی مگر شوہر کمرے کے باہر جانے نہیں دیتا۔ پھر وہ عذاب دہ وقت بھی آ گیا تھا جب شوہر کو سلانے کی خاطر دوائیوں کا استعمال کرنے کے بعد ہی بیوی کو گھنگھرو اُتار کر اپنے لہولہان پیروں پر مرہم لگانے کا وقت مل جایا کرتا تھا یا اپنے بیٹے کو سینے سے لگانے کا وقت مل جایا کرتا تھا۔ تب وہ سسک سسک کر ان دنوں کو یاد کیا کرتی تھی جب شوہر دوران رقص اپنی بیوی اور محبوبہ کی الجھی لٹ سلجھانے کے بہانے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا کر رومانی غزلیں سنایا کرتا تھا جب کہ اب جاگتے ہی یا ہوش میں آتے ہی اپنی نظریں گھنگھرو پر رکھ کر مسرت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ گویا اس کو اپنا بیٹا بھی نظر نہیں آیا کرتا تھا بلکہ جب بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا کرتا تھا تب وہ اُس کو اس کے ریاض میں خلل ڈالنے والی شے سمجھ کر اس کو کمرے سے نکال دیا کرتا تھا۔ پھر ماں بیٹے کو بنگلے کے ایک دوسرے سے جڑے بے شمار بھول بھلیوں میں پھنس جایا کرتی تھی ہر بار کوئی اجنبی اس کو اپنے کمرے کے اندر لے کر جایا کرتا تھا اور وہ بار بار اپنے بیٹے کو کمرے کے کسی کونے میں یوں دیکھا کرتی تھی گویا ایک سجاوٹ کے لئے رکھی ایک پتھر کی مورت۔! یوں وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا بدبخت بیٹا بھی ورثے میں بیمار لے چکا ہے یعنی سبز و پھر نیا! کئی بار بیٹے کو لے کر فرار ہونے کے منصوبے بنا ڈالے جو

کامیاب بھی ہو جاتے کیوں کہ شہر والوں کے آغا صاحب کا بنگلہ نہ تو قابل توجہ تھا اور نہ وہ قابل غور تھا۔ مگر ایک مشرقی خاتون اپنے بیمار شوہر کر چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی؟ اور پھر پیروں میں ٹیٹنس (Tetanus) کی شکار ہو کر چل بسی تو بنگلہ اجنبیوں کے قبضے میں آ گیا۔ چوں کہ دہشت کے عالم کو تقویت دینے کی خاطر یکے بعد دیگرے ہو رہے دھماکوں کی وجہ سے شہر میں کرفیو نافذ تھا اس لئے میت کو آغا صاحب کے بنگلے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا تھا۔ دفن کرتے وقت شوہر اجنبیوں کی طرح ایک تماشائی بن کر خاموش رہا تھا، کئی دنوں تک! پھر ایک رات آغا صاحب کا چھوٹا پوتا چیختا چلاتا رہا اس لئے کہ بنگلے میں رہنے والوں نے اپنی سلامتی کے لئے پہلے بنگلے کو تاریکیوں کا پیرہن پہنانے کے لئے بنگلے کی ساری روشنی اپنے قبضے میں رکھ دی تھیں۔ یعنی جب جی چاہا بنگلے میں مکمل بلیک آؤٹ (Black Out) اُسی رات دو گولیاں چلیں، ایک مرحوم آغا صاحب کے چھوٹے پوتے کی آوازیں ہمیشہ کے لئے خاموش کرنے کے لئے اور دوسری مرحوم آغا صاحب کے پڑپوتے کو کرفیو کی خلاف ورزی کے لئے کیوں کہ وہ بے تکے جوابات دے کر آغا صاحب کے بنگلے کی طرف دوڑ کر جانے لگا تھا۔

باپ اپنے دادا کے بنگلے میں گھس بیٹھے، جو بنگلے کے مالک تھے اور شہر میں بم کے دھماکے کرنے والے لوگوں کی گولی کا شکار بن گئے جب کہ بیٹا شہر میں امن بحال کرنے والوں کی گولی کا شکار بن گیا۔ بنگلے کے اندر جو ہوا وہ کوئی جان نہیں پایا اور بنگلے کے باہر کیا ہوا وہ بھی کوئی جان نہیں پایا۔ اور یوں پھر آغا صاحب کا بنگلہ نہ قارئین کے لئے نہ سامعین اور نہ ناظرین کی دلچسپی کا موضوع بن سکا۔! مگر وہاں بنگلے کے قابض اپنا مقصد پورا کرنے کی سعی کرتے رہے۔

مرحوم آغا صاحب کے بنگلے کی تواریخ کو مسخ کر کے مگر جغرافیہ کا فائدہ لے کر!!



عجوبہ

وہ جو کبھی اسی شہر کی کسی بھی پارک میں یا چوڑی سڑک کے کنارے اپنا دانت منجن بیچنے سے پہلے اپنے اردگرد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر عشقیہ یا طلمسی کہانیاں سنایا کرتا تھا، آج تقریباً بارہ برس بعد نظر تو آیا تھا مگر ایک نئے رنگ میں! جس طریقے سے وہ ایک ٹوٹے پھوٹے زنگ آلودہ بائیسکوپ کے بارے میں بولتا جارہا تھا کچھ لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ بائیسکوپ بھی کسی سیاسی پارٹی کا چناؤ نشان ہوگا، مگر بیشتر لوگ جو اُس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے، وہ اس کو کوئی دیوانہ سمجھ کر اس کی دیوانوں سی باتیں نہایت دلچسپی سے سن رہے تھے۔

وہ ایک نیوز ریڈر کی طرح بار بار وہی باتیں سنا تا رہتا تھا جو وہ کچھ دیر پہلے بتا چکا تھا۔ یعنی ایک ٹیپ بج کر ہر بار یہ سناتی تھی کہ یہ ایک عجوبہ ہے جو کرشماتی جواب دے کر ہر سوال پوچھنے والے کو چونکا دیتا ہے۔ تو سامعین وناظرین! مہربان اور قدردان!! قریب آکر اس بائیسکوپ کے اندر جھانک کر دیکھیے تو! نہ آگرے کا تاج محل نظر آئے گا اور باقی بچے چھ عجوبات کی تصویریں نظر نہیں آئیں گی! نہ دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصویریں نظر آئیں گی نہ جنت یا جہنم میں جانے والے انسانوں کی خوشحالی یا بدحالی کی کوئی لبھانے والی یا ڈراؤنی جھلک نظر آئے گی! مگر ہاں سوال کو بڑبڑا کر کیا جائے، گھبراہٹ سے پیدا ہوئی لرزش سے پوچھا جائے یا حاتم طائی کی طرح بے خوف ہو کر پوچھا جائے تو اندر لگے شیشے میں ایک تصویر ابھر کر آئے گی۔ اُس تصویر میں ہی تو سوالات کے جوابات پوشیدہ ہیں!۔ ہاں!! جو یقین نہ آئے تو خود ہی آزما کر دیکھ لیجئے۔!۔!اجب لوگ بھاگنے لگے تھے تب وہ دیوانوں کی طرح چلاتا رہا۔ سنو تو! دیکھو تو!!

سامعین وناظرین! ذرا پلٹ کر میرے بائیسکوپ کو گھور گھور کر دیکھتے رہیے اور میری باتیں غور سے سنتے رہیے!! ہاں یہ سچ ہے کہ میں ایک دیوانہ ہوں اور آپ کا سوچنا کہ دیوانہ تو دیوانگی کی ہی باتیں کرسکتا ہے، صحیح ہے مگر آپ میں جن قارئین کا مطالعہ وسیع ہے وہ ذرا یاد کرلیں کہ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ وکرماجیت کا تخت جس جگہ دبا ہوا ہے وہاں ایک خرافات بکنے والے ایک نیم پاگل کو جب بٹھا دیا گیا تب وہ دانشوروں کی طرح باتیں کرنے لگا! یوں سمجھ لیجئے کہ میرے اس بائیسکوپ میں بھی ایسی تاثیر رہنمائی ہے۔!

صاحبان، مہربان اور قدردان! میرا یہ بائیسکوپ ٹوٹا پھوٹا اور زنگ آلودہ کیوں ہے! میں آپ کو بتادوں گا۔ میں ایک کھنڈر میں اپنے ماضی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک کھنڈر میں مجھے اپنی معشوقہ منوہری ملی تو مجھے یاد آیا کہ دو پیار کرنے والوں کو جدا کروانے والوں پر کیسے قہر ٹوٹ پڑا تھا اور شہر موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈروں میں بدل گئے۔!

ایک اور کھنڈر جو ایشیا کی سب سے بڑی جھیل وُلر میں زیرآب ہے، مجھے اس کمہار کا گھر ملا تھا جس نے شہر کے لوگوں کو قبل از وقت اطلاع تھی کہ شہر ڈوب جانے والا ہے۔ بھاگ جاؤ ورنہ پانی کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو جاؤ گے!

اب ایک کھنڈر میں مجھے یہ بائیسکوپ ملا۔ تو یقین کیجئے میں نے اس کو ٹھوکر ماردی تھی، یہ سوچ کر کہ سینما، ٹی وی اور کمپیوٹروں کے زمانے میں دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں بڑے تو کیا بچے بھی بائیسکوپ کیوں دیکھ لیں گے مگر جب میں نے اس کے اندر روشنی دیکھی تب میں گھبرا گیا۔ یہ سوچ کر کہ جیسے بچوں کو اُڑانے کے لئے آج کل کے شیطان بم رکھ دیتے ہیں شاید کسی نے کھنڈر اُڑانے کی خاطر بائیسکوپ میں بم رکھ دیا ہوتا کہ تواریخ کو بدلا جائے۔ سیاست کو فروغ دینے کی خاطر۔! ووٹ بینک کو متاثر کرنے کی خاطر یا پھر شیطانی آگ گلانے کی خاطر! میں تذبذب میں تھا اور یہ سوچ کر کہ میں مرجاؤں تو کیا لاکھوں بچ جائیں تو اچھا۔ میں نے بائیسکوپ کو اٹھا لیا۔ اندر ایک چھوٹا سا اسکرین دیکھا تو بڑبڑانے لگا۔ یہ کوئی طلسمی پیکر تو نہیں ہے۔ تب اسکرین پر ایک چہرہ ابھر کر آیا جو سر ہلا کر 'نہیں نہیں' کا اشارہ دے رہا تھا۔!

دراصل یہ میرا ہی عکس تھا جو میں ایک اندر لگے آئینے میں دیکھ رہا تھا!

میں نے جب بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے سوالات کیے تو میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ میں اپنے گھر میں ایک چمتکاری آلہ لایا ہوں جو ایک عجوبہ ہے۔

سات رنگوں، سات آسمانوں، سات سمندروں، سات عجوبوں کے بارے میں میں نے سوالات کیے تو جوابات تصویروں کی شکل میں آنے لگے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بائیسکوپ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ ورنہ میں اِس کو لے کر آپ کے سامنے کیوں پیش ہو جاتا! آیئے! قریب سے دیکھیے! جھانک کر اپنے اپنے سوالات پوچھیے۔! بلا جھجک پوچھیے! بڑبڑا کر پوچھیے، سرگوشیوں میں پوچھیے یا چلا چلا کر پوچھیے! پھر جھان کر دیکھیے۔ سامنے ایک تصویر نظر آئے گی۔ جو عیاں ہوگا اُس کو خود بیان بدل کر سن لیجیے۔! اس میں حیرت والی کون سی بات ہے؟ تصویر یا تصویریں ابھر کر آتی ہیں یا نہیں۔ وہ آزما کر دیکھیے! واہ جناب کرشماتی طوطا آپ کا فال نکال دے وہ قابل بھروسہ ہے اور یہ تصویریں گمراہ کن کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہاں۔ مایوس کن ہو سکتے ہیں۔! کوئی پوچھ بیٹھے کہ کیا میں خاقان بن سکتا ہوں تو جواب میں اسکندر اعظم کی خالی ہاتھ اپنے آخری سفر پر جانے کی تصویر آجائے؟! مطلب یہ کہ جب ارسطو جیسے استاد کے ہوتے ہوئے وہ دنیا پر حکومت کرنے کی حسرت لے کر خالی ہاتھ اس دنیا سے ہی چل پڑا تھا تو تم ......؟ خود ہی سمجھنے والی بات ہے نا!؟ ایک عقیدت کو ماننے والے لوگ ایک پراچین مگر متبرک کتاب 'برہست کتھا' کو سامنے رکھ کر پہلے اس تصویروں والی کتاب کی پرستش کرتے ہیں پھر من میں سوال کرتے ہوئے کتاب کا ایک ورق پلٹ دیتے ہیں۔ ایک تصویر سامنے ہے اور سوال کا جواب عیاں ہو گیا۔ تصویر میں ایک رانی شان و شوکت سے جلوہ گر تھی۔ اردگرد کئی ساز بجا رہی حسینائیں اور رقص کر رہی رقاصائیں۔ مگر رانی کے پاؤں میں سونے کی زنجیریں۔

اُس عورت کو اپنے دولت مند شوہر نے بیوی کے حقوق سے محروم کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ گھر کی مالکن تھی! اچھا اگر آپ لوگ ایسے سلسلے کو بے ہودہ کہہ کر نامنظور کر رہے ہو تو پیشن گوئیاں کرنے والے ناسٹرڈامس کی بات کر رونا؟ وہ مستقبل میں ہونے والے حالات، واقعات، حادثات اور سانحات اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک بہت بڑے منہ والے برتن میں موجود پانی میں عکس دیکھا کرتا تھا اور لکھ کر رکھ اپنی بہت ساری پیشین گوئیوں کو امر کر دیا کرتا تھا۔ جن میں

بیشتر صحیح ثابت ہوکر دنیا کو چونکا دینے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ٹھیک ہے جن کو میرے اس عجوبے سے سوال پوچھ لیتے ہیں وہ ایک قطار میں کھڑے ہوجائیں۔ میں ایک ایک کرکے آپ کو بلادوں گا۔

ایک گول چھوٹی سی کھڑکی سے سوال پوچھنے والا یا پوچھنے والی جھانک کر دیکھ لے اور دوسری گول کھڑکی سے میں دیکھتا رہوں گا۔ اور تصویروں کا مفہوم سمجھایا کروں گا۔ اچھا میں آپ سب کو اپنے بائیسکوپ کی خوبیاں اور خامیاں بتا دینا چاہوں گا۔ پہلے غور سے خوبیوں کے بارے میں بتادوں گا:

(۱) یہ جھوٹ نہیں بولتا۔

(۲) یہ چار نام سمجھ سکتا ہے۔ یعنی بھگوان، انسان، حیوان اور شیطان۔ انسان اور حیوان کو وہ اچھا یا برا سمجھتا ہے۔ آپ اگر ہندو یا مسلمان، برہمن یا ہریجن کے حوالے دے کر سوال پوچھ لیں تو جواب نہیں دے گا بلکہ جواب آیا بھی تو یا تو دھول نظر آئے گی یا دھواں!

(۳) سوال غیر مناسب ہو، غیر اخلاقی ہو یا کسی سازش کا حصہ ہو تو اسکرین کا رنگ لال ہوجائے گا اور وہ روٹھ کر جواب دینا بند کردے گا۔

اور میرے بائیسکوپ کی خامیوں کے بارے میں بھی بتا دینا چاہوں گا:

(۱) میرا بائیسکوپ آپ کو ماضی کے بارے میں یا پھر مستقبل کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ حال کے بارے میں نہیں، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ حال میں حالت بدحال ہے۔

(۲) میرا بائیسکوپ ایک ایسا عجوبہ ہے جو پتھر کے زمانے سے تا حال تمام لڑائیوں کے بارے میں طاقور فاتحوں کے بارے میں کچھ بتانے کی بجائے جنگ میں مارے گئے لوگوں کے بارے میں بتادے گا۔ ظلم ظالم اور مظلوم کے بارے میں دردناک مناظر دکھا سکتا ہے۔ آپ رمائن کے بارے میں پوچھیں یا مہابھارت کے بارے میں پوچھ لیں، تب بھی۔ دیوی دیوتاؤں کی راکھشسوں کے قہر آلودہ یدھ کے بارے میں پوچھ لیں یا آج کل کے حکمرانوں اور دہشت گردوں کے ہو رہے گوریلا جنگ کے

بارے میں پوچھ لیں! کالنگا کی لڑائی کے بارے میں پوچھ لیں یا واٹرلو کی جنگ کے بارے میں پوچھ لیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں پوچھ لیں یا دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں پوچھ لیں۔ کارگل جنگ کے بارے میں پوچھ لیں یا عراق پر ہوئی بمباری کے بارے میں پوچھ لیں۔ پارلیمنٹ پر ہوئے دہشت گردوں کے بارے میں پوچھ لیں یا کسی فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں پوچھ لیں ۔ راجہ پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا کے عشق کی داستان کے بارے میں پوچھ لیں یا سلطان یوسف جک اور شاعرہ حبہ خاتون کی محبت کے بارے میں پوچھ لیں۔ یہ رہی ماضی کی باتیں۔ اور مستقبل کے بارے میں وہ صرف ہونے والی تباہی اور بربادی کے بارے میں بتادے گا تاکہ سوال پوچھنے والے اپنے انجام سے باخبر ہوکر چنگاریوں کو انگارے یا شعلے بن جانے سے پہلے ہی بجھا دینے کی سعی کریں۔ چنگاریاں اقتصادی بحران سے پیدا ہوں۔ سرحدوں کی رسہ کشی سے پیدا ہوں، ہوس اور حرص سے پیدا ہوں، گندی سیاست یا فرقہ پرستی کے ٹکراؤ سے پیدا ہوں یا غیر ملکی مداخلت سے پیدا ہوں۔

بائیسکوپ والا آنکھیں بند کر کے بولتا رہا۔ گویا وہ یہ تمام سوال بائیسکوپ سے پوچھ چکا تھا اور اب یاد کر کے بول رہا تھا تاکہ سوال پوچھنے والے سوچ سمجھ کر ہی سوال پوچھ کر معقول سوچ وسمجھ کی مدد سے کوئی قدم اٹھا سکیں۔

جب اس نے آنکھیں بند کی تھیں تب اس کے سامنے ایک لمبی قطار تھی لیکن جب اس نے ایک بار کہتے کہتے آنکھیں کھول دیں تب ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر اُس نے ہونٹ سی لئے اور بائیسکوپ اٹھا کر اپنے گھر چل پڑا۔

گئی رات یہ ایک دوسرے سے جنوں کی حد تک عشق کرنے والی پیار کرنے والے بائیسکوپ والے کے گھر والے پہنچ گئے۔! اور یہ جان کر بے حد دُکھی ہو گئے کہ ایک دیوانہ ایک بہت ہی کارآمد عجوبے کو اگلی صبح زمین میں ایک لاش کی طرح دفن کرنا چاہتا تھا نہ ایک ٹائم کیپسول کی طرح زمین کی نچلی تہوں میں دبانا چاہتا تھا۔ محبت کرنے والوں کے دل ایک جیسے تھے، سوچ و سمجھ ایک جیسی تھی، قول اور عمل ایک جیسے تھے اور ان کا پیار اتفاقاً نہیں ہوا تھا۔ چاہت کا جذبہ

محبت میں بدل گیا تھا۔ پھر عشق نے اپنی مہک سے دونوں کی زندگی کو معطر کر دیا تھا اور پھر جنون نے لیلیٰ مجنوں بن جانے کی بجائے دونوں کو ایک چھت کے نیچے میاں بیوی بن کر زندگی گزارنے کی خواہش کو جنم دیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دونوں کا مذہب جدا ہے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ دونوں اپنے عقیدوں سے پیار کرنے والے مگر اپنے اپنے مذہب کا احترام کرتے ہوئے دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں اور بائیسکوپ سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ دیوانے نے کہا کہ بہت ساری شادیاں ہو چکی ہیں اس لئے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟

دونوں خوش ہوئے کیوں کہ ایک انسان تو مل گیا تھا جوان کی مدد کرنے کے لئے تیار تھا خاص طور پر جب دیوانے نے ایک ہندو ڈاکٹر کی ایک مسلمان ڈاکٹر کے ساتھ کی گئی شادی کو کامیاب بتایا تھا۔

اچانک جب دونوں نے بائیسکوپ سے سوال کیا تو اس نے سینکڑوں مثالیں دے کر دونوں پیار کرنے والوں کا حوصلہ بڑھا دیا۔ فلمی دنیا کی مثالیں، سیاست دانوں کی مثالیں، سنگیت کاروں کی مثالیں، راجوں اور مہاراجوں کی مثالیں، کھلاڑیوں کی مثالیں۔

اچانک دیوانے نے دونوں سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ دونوں نے بتادیا کہ وہ ایک سرکاری سپر بازار میں کام کرتے ہیں اور دونوں کی تنخواہ جوڑ کر ایک پُرسکون زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ تب دیوانے نے اپنے بائیسکوپ سے پوچھا کہ دونوں کا مستقبل کیا ہے؟ تو بائیسکوپ نے جو تصویر اب دکھادی تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ دیوانے نے آہ بھر کر دونوں سے کہا کہ یہ رعایت صرف امیروں اور اونچی سوسائٹی والوں کے لئے ہیں۔ غریبوں کے لئے نہیں۔! بھول جاؤ ایک دوسرے کو! کہیں میرے عجوبے کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تو سارے ملک میں ایک خطرناک تحریک شروع ہو جائے گی! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شادی کسی سیاسی پارٹی کے مینی فیسٹو (Manifesto) کا پہلا حصہ بن جائے اور دیکھا دیکھی میں مخالف پارٹی والے بھی اس کو ایک اہم نقطہ بنا سکتے ہیں۔ ہاں اگر تم امیر ہوتے، رسوخ والے ہوتے یا پھر مشہور و معروف ہوتے تو تمہاری شادی بھی اردنا اور آصف علی کی ایک مثالی شادی کہلاتی! سنیل دت اور نرگس کی کامیاب شادی کہلاتی! غریبوں کی شادی ایک سماجی کم اور سیاسی مسئلہ زیادہ بنایا جاتا ہے، لڑکی پر

الزامات لگائے جاتے ہیں۔ یعنی اپنی خوبصورتی کو متاعِ کوچہ و بازار بنا کر ایک گاہک کو لبھاتی آئی ہے اور اب گاہک کو اجگر کی طرح نگل کر شادی کا نام دینا چاہتی ہے چڑیل! یا پھر۔!۔؟ لڑکے کو بھی کوئی نہیں بخش دیتا ہے۔ یعنی آج جس پھول کو گلے سے لگانے کی بات کر رہا ہے، اُس کو کچل کر کسی نالے میں پھینک دے گا۔ نالی میں گرے ہوئے پھول کو نہ پوجا کی تھالی میں رکھا جاتا ہے اور نہ ارتھی پر رکھا جاتا ہے۔ یعنی نہ کوئی قدردان مل جاتا ہے اور نہ کوئی خریدار مل جاتا ہے۔! اور یہ شادی ایک سازش ہے۔!! پھر شروع ہو جاتا ہے ایک سنگرام یعنی ایک سیاسی جنگ۔! فسادات کی شروعات کے بعد قتلِ عام۔! مرنے والے انسانوں میں ہندو میں ہوتے ہیں اور مسلمان بھی! یہ شادی نہیں بربادی کا ایک باب ہوگا۔

دیوانہ یوں کہتا رہا جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی تصویروں کو الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی اور وہ اپنے لب سی لینا چاہتا تھا مگر کرب کی شدت سے پھر لب تھرتھرائے تھے اور اس کے ارادوں کے ٹانکے ٹوٹ چکے تھے ورنہ وہ شاید ہر سطر کہہ کر خاموش ہوا ہوتا۔!

آخر بار بائیسکوپ کو دیکھ کر دیوانے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور دو پیار کرنے والے، پیار کرنے، پیار و محبت سے زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے والے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بائیسکوپ کو یوں دیکھتے رہے گویا وہ ایک عجوبہ نہیں بلکہ ایک عام انسان کی طرح ایک الیکشن سے پہلے ایک بیلیٹ بکس (Ballot Box) کو دیکھتے رہتے ہیں۔!



عزم

دونوں کا عزم اتنا بلند ہے کہ وہ کنجشک کو بچانے کے لئے اونچی پرواز کرنے والے شاہین کو پکڑ سکتے ہیں لیکن کچھ کرنے سے پہلے ہی ناکامیابیوں کے بادصرصر سے وہ مشکلاً اپنے آپ کو سنبھال پاتے ہیں، وہ بھی اپنے عزم کی بلندی کی وجہ سے!

وہ اپنی ناکامی سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اپنی خوبیوں سے اپنی خامیوں پر توجہ مرکوز کر کے کسی بہتر تجویز پر غور کرتے ہیں، لیکن آج مشرق کو مغرب، شمال کو جنوب سے الغرض ساری دنیا کو ایٹمی توانائی سے پیدا ہوئی حرارت کی اُس سطح کو روکنے اور صدیوں سے پرانے گلیشروں کو پگھل کر سمندروں کی سطح تک بڑھ جانے کے معقول سیمینار (Seminar) میں حصہ لینے کی خاطر آئے تھے تاکہ سات سمندروں کے ایک ہو جانے سے زمین کو ڈوب جانےسے بچایا جاسکے۔ یعنی زمینی جان داروں کو بچایا جاسکے، بلکہ اُبل رہے سمندروں کے پانی سے پان میں رہنے والے جانداروں کو بچایا جاسکے۔

اُن کی تجویز یہ تھی کہ ایٹمی قوت سے بجلی پیدا کی جائے نہ کہ آگ!

اس سے پہلے کہ امن پسند ممالک کے سائنس داں ان کے مشورے پر کچھ کہہ پاتے، ایٹمی طاقت کے بل بوتے پر خاقانِ جہاں بننے والوں نے نہ صرف تجویز کو مسترد کر دیا بلکہ ان کے حکم پر حکومت نہ کرنے والوں کو یوں ک دبا دیا گویا چیونٹیوں کو میخ دار جوتوں سے کچلنے کے اشارے دیے گئے۔

دونوں سائنس داں اس بار اس قدر لڑکھڑاتے رہے گویا غم کو شراب میں یوں ڈبو دیا تھا

جیسے ایک گہری جھیل میں ٹوٹے گلدان لرز رہے مہکتے ہوئے پھولوں کو اپنی گود سے پھینک کر پانی کی تہیں کاٹ کاٹ کر اپنی آخری منزل ڈھونڈ رہے تھے۔

دراصل دونوں نے بہت شراب پی لی ہے اور وہ ایک انجانے راستے پر چلتے چلتے باتیں کرتے ہوئے ایک بے شکل کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اچانک ایک سائنس داں کے تھم گئے اور وہ چونک کر چلانے لگے...... ''دیکھ، دیکھ۔ اِدھر اُدھر دیکھ، چارسو دیکھ! سمندروں، جھیلوں، کنوؤں، چشموں، ندی نالوں اور دریاؤں کا سارا پانی ایک پرندہ پی گیا۔! اب پیاس لگے تو کیسے بجائیں۔؟''

دوسرا ہنس پڑا اور اعتماد سے بول پڑا...... ''شبنم سے! بارش سے! برف سے!!''

پہلا بوکھلا کر بول پڑا...... ''سمندر نہیں تو بھاپ نہیں۔ بھاپ نہیں تو آکاش میں بادل نہیں۔ بادل نہیں تو نہ بارش ہو سکتی ہے اور برف باری!''

دوسرا ہنس پڑا اور بول پڑا...... ''دو حصے ہائڈروجن کے اور ایک حصہ آکسیجن کا۔ دونوں کو ہوا سے نکال دیں گے اور ہم پانی بنا دیں گے۔ اور ہوا پر کسی ملک کا دعویٰ نہیں۔''

پھر وہ دونوں بڑبڑانے لگے'' ہمارا عزم بلندی پر ہے مگر ہمارے پیر زمین پر کیوں ہیں؟''

اچانک پہلا خوشی سے اچھل کر بول پڑا...... ''آواز سن رہے ہو۔ پرندہ ہمارے عزم سے ڈر کر پانی اُگل رہا ہے۔ پھر سمندروں میں پانی جمع ہوگا۔ یہ پانی کی لکیر ہی ندی بن جائے گی۔ ندی دریا، دریا سمندر میں ہی تو گر جائے گا نا۔''

دوسرا بول پڑا گویا اپنے عزم کی بلندی بتا رہا ہو۔ ''پانی کی لکیر دیکھ لوں گا، مگر پیشاب تو کرنے دو۔ میرے ہم نفس، میرے ہم نوا!!''



چوہا

جس کے چہرے پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی، اس کو بلا وجہ قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر ارد گرد کھڑے لوگ بول پڑے، اجالا پہلے نیم پاگل تھا اب پورا پاگل ہوگیا! اجالا نہ تو اُس کا اصلی ام ہے اور نہ تخلص ہے کیوں کہ وہ شاعر بھی نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی قابل جج جس کو ان کے مداحوں ے اجالا کا لقب دیا ہے وہ اس لیے کہ قانون کی آنکھوں پر لگی پٹّی کے باوجود وہ سچ کی اجلی کرنیں دیکھ کرانو کھے فیصلے سا کران لوگوں کے چہروں سے جھوٹ کا نقاب اُتار دیتے ہیں جو دولت کی طاقت سے سچ کو جھوٹ کے منوں تودوں کے نیچے دبا دیتے ہیں، اُن کو یعنی اجالا صاحب کو پسند کرنے والے زیادہ ہیں اور ناپسند کرنے والے بہت ہی کم ہونے کے باوجود اتنی مشکلیں پیدا کر چکے ہیں کہ ہر تین ماہ کی تبدیلیوں کی وجہ سے نہ گھر کے رہ گئے ہیں نہ گھاٹ کے اور یوں اب مقدموں پر بحث سے کی بجائے ایک سینوٹوریم (دق کے مریضوں کا مخصوص اسپتال) میں ہر وارڈ میں آتے جاتے یا تو کھانسی کی کھن کھن کی آوازیں سنتے رہتے ہیں یا پھر ایک چوہے کا بار بار ذکر سناتے رہتے ہیں، وہ بھی ایسے جیسے بھی چوہے کے کارناموں سے ستائے ہوئے ہیں۔

مریضوں کی دوائیاں کون کھا جاتا ہے؟ وہی موٹا چوہا۔!!

اُن رحم دل لوگوں کے دیے مریضوں کے لیے پھل کون کھا جاتا ہے؟ وہی موٹا چوہا!!

اُجالا نے اپنی بیماری کی شدت برداشت کر کے اپنے خرچ پر مریضوں کو دوائیاں، پھل، صاف ستھرے ماحول میں رہنے کے لیے بیڈ شیٹ منگوادیے۔ میڈیا والوں نے خبر کو

سرخیاں بناڈالا تو انھوں نے ایک قابل جج جو خود ہی ملزم بھی اور اپنے بچاؤں کے لیے دلیلیں اور قوانین کے حوالے دینے والے وکیل پر ان کے نیک اعمال کو روکنے کی خاطر ایک سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر سیاست میں قدم رکھنے کا ایک چالاک اور مکار منصوبے کا ایک بلیو پرنٹ (Blue Print) بتا کر سرکار کی مدد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکامیاب ہو کر چوہے کو رنگے ہاتھوں وٹامن کی گولیاں چراتے پکڑ لیا تو مریض ہنسنے کی وجہ سے سینے میں جلن محسوس کرتے ہوئے بھی خوشی کا اظہار کرتے رہے کیوں کہ اُن کے ہی بچھائے جال میں چوہا پکڑا گیا تھا۔ اجالا دوڑ کر چوہے کو دیکھنے گیا تب وہ سکتے میں آ گیا کیوں کہ وہ بلّی سے ڈرنے والا چوہا نہیں تھا بلکہ اسپتال کا ایک ملازم تھا۔ اجالا یہ دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

اجالا نے تاریکیوں میں روشنی دیکھی مگر اس بار وہ سکتے میں آ گیا کیوں کہ اس کو ایک اپنا پرانا واقعہ یاد آیا۔ اس نے ایک باعزت بری ہوئے اسٹور کیپر سے ذاتی طور پر پوچھا تھا کہ ''یہ تو اب بتادو کہ وہ لوہا جا تمہارے اسٹور میں پایا گیا تھا وہ آخر گیا کہاں؟ اسٹور کیپر نے اعتماد سے کہا تھا کہ لوہے کو چوہے کھا گئے۔ پھر ہنس کر کہا تھا کہ چوہوں کو پکڑنے کے لیے سرکاری بلیوں کی ضرورت ہے''۔ یہ سن کر تب وہ ناراض ہوا تھا مگر قصہ یاد آیا تو بے ساختہ قہقہے لگا تا رہا!



دیوانگی

یوں تو ایک دشوار سفر طے کرنے کے بعد اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہی ایک کامیابی کی شناخت ہے اور کامیاب انسان فخر سے اپنی کامیابی کی خوبیوں کا فخر سے ذکر کرتا ہے، مگر یہ شخص اپنی کامیابیوں کی خامیوں کے بارے میں یوں سوچتا رہتا ہے گویا سمندر میں وہ سیپ ڈھونڈ رہا ہو جس میں اس کا مطلب موتی ہو۔

یہ شخص بچپن سے ہی اوسط سے بہت زیادہ ذہین ہے۔ لڑکپن سائنس کی ایجاد کے بارے میں سوچ سوچ کر گزرا ہے اور رفتہ رفتہ جوانی میں وہ ایسی باتیں سوچتا رہا جسے دانشور تو کیا عام لوگ بھی ایک اچھے سائنس داں کی دیوانگی سمجھنے لگے تھے۔ پھر ناسا (Nasa) میں اپنی ایجادات یا چاند سیاروں پر زندگی کی معلومات کرنے کی بجائے زمین پر زندگی کو تر و تازہ و شاداب اور پر کیف بنانے کے لئے تجاویز دینے لگا تو دنیا کو نکولائی تراز و پر ملی گراموں سے اپنی طاقت کا پلڑا بھاری دکھا کر دنیا کو اپنا غلام بنانے والوں نے اس کو اپنی عجیب و غریب فطرت کا غلام ہونے کے سبب ایسے حالات پیدا کیے کہ ایک مشہور اور معروف سائنس داں کو دنیا داری سے بیزار ہو کر جنگلوں میں زندگی بسر کرنے والا ایک زاہد بنا دیا۔ گویا عادت عیب بن گئی، جنگلوں میں رہ کر بھی اُس کے ذرخیز ذہن میں کائنات افروز پودے اُگتے رہے، یعنی کیسے جنگلوں کی مدد سے اُس حرارت کی سطح کو زمین کے قریب آنے سے روکا جائے جس سے برف کے پہاڑ، گلیشر کو پگھلا کر سمندروں میں پانی کی سطح اتنی بڑھ جانے کا خدشہ ہے کہ آب زمین کو دبوچ لے گا۔ چڑھ رہا پانی اُبل کر آبی جانوروں کو جھلس کر مار دے گا جبکہ زمین پر رہنے والے جاندار گرم پانی کا کفن اوڑھ کر

پانی میں دفن ہو کر فنا ہو جائیں گے، لیکن ایسی آرزوئیں حسرتوں میں یوں بدلتی رہیں جیسے پانی کے بلبلے بود ہوتے ہی نابود ہوتے ہیں۔

ایک روز رامائن پڑھتے ہوئے اچانک ایک خیال منجھی ہوئی چٹکی سے نکلا، تیر دماغ اتنا گہرا اتر گیا کہ نکال پھینکنے کو جی نہیں چاہا۔

ایک عام سی بات اس کے لئے خاص بن گئی اس لئے نہیں کہ ڈارون (Darwin) نے یہ کیسے ثابت کیا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا بلکہ اس لئے کہ جب ہم بندروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتے تو رام کی لشکر میں شامل بندر اور انسان ایک ساتھ راون کی فوج کے ساتھ کیسے لڑ پائے تھے۔ پھر کیا تھا، ایک پروجیکٹ کی شروعات ہوئی۔

پہلی بار اُس نے بندر کے ساتھ دوستی کی لیکن پورے اعتماد سے اُس نے اپنے دوست، جس کا نام اُس نے ہنومان رکھا تھا، کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو ہنومان اُس پر یوں ٹوٹ پڑا گویا ایک بلی چوہے کو دبوچ ڈالا تھا۔ پھر اس نے بندروں کی طرح درختوں کی شاخوں پر اچھل کود کر کے اپنے جسم کو لہولہان کر دیا، بلکہ بندروں کی طرح اپنے جسم کو ناخنوں سے کھرچتا رہا، پلٹیاں بھی مارتا رہا جو دیکھ کر بہت سارے بندر بھی اس کے دوست بن گیا، وہ سمجھتا رہا کہ بندروں سے اس کی دوستی ہوئی مگر ایک روز جب اس نے ہنومان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مشکلاً اپنی آنکھیں بچا پایا۔ ایک ضدی سائنس داں نے ہوا بازوں کی پوشاک پہن کر ہنومان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ اُس نے معمول کی طرح چنے، کیلے، پھل اور روٹیاں اپنے آشرم کے ارد گرد پھینک دیے تاکہ بندر قریب آجائیں۔ پھر بھی وہ خوش تھا کیوں کہ اُس نے ہنومان کی آنکھوں میں جھانک کر خوف کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ یہ اس کی کامیابی کے عکس تھے۔ یعنی خوبی تھی! مگر حسبِ عادت اُس نے کامیابی میں خامی بھی دیکھ لی اس لئے اپنی فطرت کا غلام اپنے آقا کے حکم پر ایک سائنس داں کی طرح سوچ میں ڈوب گیا اور ایک خط لکھ کر ناسا (NASA) والوں کو یہ اطلاع دی کہ ہوسکتا ہے چاند پر زندگی ہو لیکن بندروں کی طرح ہمارے چاند پر جانے والے ایسٹروناٹس (ASTRONAUTS) کی پوشاک دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چھپ جایا کرتے ہوں۔! اس کے

بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ تیل سے بھرے صحراؤں میں بموں کی بارش کرنے کی اہمیت ہے۔!

کسی نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔

گویا پہلی بار اس کو نہ اپنی منزل مقصود میں خوبیاں نظر آئیں اور نہ خامیاں۔ آہ بھر کر اُس نے اپنی کاوشوں کو دیوانگی کا نام دے کر اپنے آپ کو آشرم میں بند کر کے ایک کھنڈر بنا دیا۔ موہن جوداڑو اور ہڑپا کی طرح!!



مقصد

پھر وہی ڈفلی، پھر وہی رات، گاؤں کے اس پار اور اُس پار والے دونوں کے لئے رنگ بدلتے واقعات سے رونما ہوئے حالات اور حالات کی پیداوار، سیاست کی اُبال سے گاؤں پر چھا جانے والے بادلوں کی گرج، بن موسم برسات کے یوں عادی ہوگئے گویا وہ ڈرگس (Drugs) کھا کر جھومنے کے عادی ہوگئے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ جس اجنبی کو ہم سفر بنا کر انجانی راہوں پر زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں وہ سہانا ہے یا کٹھن ہے۔ ان کو اپنی منزل کے بارے میں علم نہیں ہے بلکہ تصور بھی نہیں ہے۔ ہاں، وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک مقصد کے لئے زندہ اور اُسی مقصد کے لئے مر مٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر گاؤں میں اس پار بھی اور اُس پار بھی چند سمجھ دار لوگ ہیں جو بدلتے حالات کی ہر کروٹ کے ساتھ حالات کا اپنے نظریے سے دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ایسا کب ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ آخر اس کروٹ کا مقصد کیا تھا۔ حالانکہ اُن کی آواز عام لوگوں کے نعروں کے شور میں یوں دب جاتی ہے گویا ایک پر جوش جلوس میں ماں سے بچھڑ چکے بچے کی رونے کی آواز۔ اُن ہی لوگوں میں چند لوگوں نے گاؤں کے دونوں حصوں کے درمیان سرحد کی حیثیت کا احساس دلانے والی سوکھی ندی میں پانی کی ایک پتلی سی لکیر دیکھ لی تو تجسس تشویش بن کر تذبذب کے دلدل میں ڈال دیا۔ وجہ یہ کہ ندی کے کناروں کو جوڑنے والا صدیوں پرانا مٹی کا بنا ہوا ایک باندھ سے جس میں ان دیکھے کئی چشموں کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے۔ برسات کا پانی بھی ایک مصنوعی جھیل میں جمع ہو جاتا ہے اور باندھ کے دوسرے حصے میں ندی خشک رہتی ہے۔ ہاں کبھی بارش میں سوکھی ندی میں تھوڑے سے

وقفے کے لئے اتنا پانی بہتا ہے جس میں بچے کاغذ کی کشتیاں بنا کر کھیلا کرتے ہیں۔ آخر باندھ پر ایک تازہ تازہ پانی کے بہہ جانے کے لکیر دیکھ باندھ کی وہ جگہ دیکھنے میں کامیاب ہوگئے جہاں باندھ میں ایک پتلی سی لکیر کرید کر یہ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ چوں کہ ایک پُر سکون جھیل کا پانی نکاسی کے لئے پورے زور و شور کے ساتھ چٹانوں کو بھی ہٹا دیتا ہے۔ مٹی کو وہ نگل کر سوکھی ندی کے کناروں کو کاٹ کر، دھان کی کھڑی فصل کو اجاڑ کر گاؤں کو اکھاڑ کر اُس پار اور اِس پار گاؤں کو کیچڑ کا کفن اوڑھا کر دفن کرنے کا منصوبہ کس کی سوچ اور پھر سوچ پر عمل نہ ہونے کے عذاب کو ثواب کا کام کیا باندھ کے نگہبانوں نے کیا ہوگا؟

سمجھ دار لوگ کھوج میں اپنے دماغ کا استعمال کرتے رہے جب کہ اِس پار اور اُس پار کے لوگوں نے باندھ کے دامن میں کیچڑ کے نیچے دو جانے پہچانے چہروں کو نیم عریاں حالت میں دیکھتے ہی ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ سیاست کی باتیں کر کے گویا دہکتے انگاروں میں بارود ڈال کر دھماکہ کرتے رہے، لڑکی اِس پار کی تھی اور لڑکا اُس پار کا تھا جن کو ایک دن پہلے غصے اور طنز کے ملے جلے تاثرات سے سوہنی اور مہیوال کا نام دے کر سرکاری چال باز کہہ کر نہ صرف گاؤں والوں نے بلکہ اپنے گھر والوں نے بھی دہلیز پار کرنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔

خبر چوں کہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی اس لئے سوکھی ندی اُس پار اور اِس پار کے لوگوں سے بھر گئی۔ سکوت کے عالم کو ایک بلند نعرے نے توڑ دیا۔ ''بے شرم اور بے حیا سوہنی کو بے نقاب کر دیا۔ اُس پار کے لوگوں کی ترجمانی ہوگئی۔ ان کے دعوے کی تصدیق ہوگئی!''

نعرہ یوں گونج اٹھا گویا بادل پھٹ گئے جس کا تاثر یہ ہوا کہ ایک دوسرے کندھے ملا کر کھڑے لوگ الگ ہو کر دو حصوں میں یوں کھڑے ہو گئے گویا سرحد پر مقابلے کے لئے تیار فوجی، جن کو اجنبی لوگ کمانڈر کر رہے تھے۔ نعرے کے جواب میں ایک بار پھر بادل پھٹ گئے۔ ''آستین کے سانپ کا انجام تو دیکھو! ڈنک مارنے سے پہلے ہی کچلا گیا۔!'' پھر فسادات کے سلسلوں کا خوفناک منظر اور ایک ہی نعرے کی گونج ''چشمے ہمارے ہیں تو پانی بھی ہمارا ہے۔''

صدیوں پہلے گزری مگر سنی سنائی سوہنی مہیوال کے عشق کی داستان سن کر اِس دور میں بھی لوگ آہیں بھر کر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کاش سوہنی محبت کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر

کچے مٹکے کے سہارے دریائے چناب پار کرنے کے لئے اپنے آپ کو موجوں کے سپرد نہ کرتی تو مہیوال بھی اس کو بچانے کی خاطر دریا میں کود نہ پڑتا مگر آج جن کو گاؤں والوں نے نفرت سے یہ نام دیے ہیں ان کی کہانی تو آنکھوں دیکھی کانوں سنی کہانی ہے۔

دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہاں لڑکی ندی کے اِس پار کے ایک رئیس باپ کی بیٹی ہے جبکہ لڑکا اُس پار کے ایک قوم پرست لیڈر کا بیٹا ہے۔ دونوں نے اپنے بچوں کو گاؤں کی سیاست سے دور رکھ کر پہلے بورڈنگ اسکولوں میں ابتدائی تربیت دی اور بعد میں بہت بڑی رقوم دے کر ایک ہی میڈیکل کالج میں داخل دلا کر خوش بھی تھے اور ڈرے سہمے بھی۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے والوں کے بچے اپنے وطن کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ایک دوسرے پر اعتماد کرتے کرتے چاہت کے غنچوں کو محبت کے شاداب مہکتے چمن میں بدلنے میں کامیاب ہوئے تھے، دونوں ابتدائی رومانی دور میں اپنے گاؤں کی پُرکشش خوبصورتی کی باتیں کیا کرتے تھے، نظریاتی اختلاف سے پہلے اپنے والدین کی دوستی کی باتیں کیا کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے جس کی اطلاع وہ وقتاً وقتاً اشارتاً اپنے والدین کو دیتے رہے۔

پھر جب دونوں نے عدالت میں شادی کر کے مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اپنی ایک الگ دنیا بسانے کی خاطر ایک بار ندی کے اُس پار اور اِس پار اپنوں سے ملنے کی خاطر طوائف لے کر گاؤں میں جس دوراز ے پر دستک دیتے رہے ان کے لئے بے صدا ثابت ہوا۔ کچھ اجنبی حاکموں نے ان کو چال باز کہا تو کچھ نے اپنوں کی جڑیں کاٹنے والی سرکاری ایجنٹ کہا۔ والدین اپنی لاعلمی ظاہر کرتے کرتے اپنی اہمیت کھو بیٹھے تو دونوں کاٹھ کے ٹکڑوں کی کناروں کے قریب یوں پڑے رہے گویا وہ اپنے نمود کی بجائے اپنے وجود کے لئے خود اپنے لئے ایک سوال بن گئے تھے۔ پہلی رات گزار کر صبح کا انتظار کرنا اور پھر چند سمجھ دار لوگوں کے اشاروں پر گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر پردیس میں رہنا تو صدمہ تھا مگر لوٹ کر اپنے وطن میں لوٹ کر نہ آنا دونوں کے لئے جذباتی طور پر، ثقافتی طور پر، بلکہ تواریخی حوالوں سے منطقی طور پر ایک سانحے کا بے شمار خانوں والا ایک خاکہ جو اگر ایک ہی رنگ سے پر کیا جائے تو آکاش کی طرح باوقار ہوسکتا تھا مگر مختلف رنگوں کے

پُر ہوتے ہی باریک لکیروں کو دراڑوں اور پھر دراڑوں کو خطرناک کھائیوں میں بدل سکتا ہے۔

سوکھی ندی میں چلتے چلتے جب گھٹن ہونے لگی تو دونوں باندھ پر چڑھ کر لمبی سانسیں لیتے ہوئے چہل قدمی کرتے رہے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے تھے کہ باندھ کے نگہبانوں، اُس پار کے اور اِس پار کے بھی، نے ان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا بھی تھا اور ان کی آوازیں اور باتیں بھی سن کر نہ ٹوکا تھا نہ روکا تھا۔ یہ ساری جانکاری ان دو سمجھدار بزرگوں کو باندھ کے نگہبانوں کے ہاتھ پاؤں کھول کر اور اُن کے منہ میں زبردستی ٹھونسا گیا کپڑا نکال کر دستیاب ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ دو اجنبی اُس پار کے نگہبان اور اِس پار کے نگہبان کو ملے تھے اور دونوں کو انہوں نے ایسی میٹھی میٹھی باتوں میں الجھا کر بہت ہی ہنرمندی سے باندھ کر، منہ باندھ کر باندھ میں لوہے کی سلاخ سے ایک چھوٹی سی لکیر ڈال کر پانی کو باندھ کے آر پار کا راستہ اس لئے دیا تھا کہ جوں جوں پانی نکلتا رہے گا لکیر شگاف بنا کر جھیل کے پانی کو تیز رفتار سے نکلتے ہوئے صدیوں پرانے باندھ کو روند کر گاؤں کے دونوں کناروں کو تباہ و برباد کر دے گا، پھر نہ گاؤں ہوگا نہ گاؤں کے آپس میں جھگڑنے والے لوگ ہوں گے اور نہ چشموں کا تنازع عالمگیر مسئلہ بن جائے گا یعنی اُن کا مقصد پورا ہوگا۔

وہ دونوں چلے گئے تو سوہنی مہیوال نے پانی کو باندھ کو کٹتے دیکھا تو دونوں نے اپنا سامان اٹیچیوں سے نکال کر ایک زبردست کوشش کے بعد پانی کی نکاسی کو اچھی طرح بند کرنے کی خاطر اپنے کپڑوں کے علاوہ بطور طوائف لائے گئے بچوں و بڑوں کے کپڑوں کا استعمال کیا۔ وہ جب تک کامیاب ہوگئے کچھ پانی سوکھی ندی میں جا چکا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہی وہ کیچڑ میں پھسل کر تقریباً پچاس فٹ اونچے باندھ سے سوکھی ندی میں گر کر دم توڑ گئے۔! لیکن اب وہی لوگ جو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، وہی سرگرم تھے اور فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ سمجھدار لوگوں نے اس پار اور اُس پار کے لوگوں کو ایک قیامت خیز سانحے کو روکنے والوں کے بارے میں بتانا چاہا تو چند اجنبیوں نے بآواز بلند اُن کو بھی سازش میں شامل ہونے کا مجرم قرار دے کر اُن کو بھی کیچڑ میں دفنا دیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا دعویٰ کر کے پھر وہی نعرے لگائے ''جس حصے میں چشمے ہیں، پانی پر ان کا ہی حق ہے۔ باندھ رہے یا نہ رہے،

اپنا حق لے کر رہیں اور اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہیں گے!''

دونوں کناروں کے نگہبانوں نے اُن دونوں اجنبی چہروں کو پہچان تو لیا تھا جنھوں نے باندھ کو اُڑا دینے کی سازش رچی تھی مگر دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے اُس پار اور اِس پار کی نمائندگی کرتے ہوئے دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئے تھے۔ گویا وہ سانسیں لے رہے پتھر تھے۔!!



مند ظاہر کرتے ہوئے میاں بیوی کے پیر، بار بار چھو رہا ہے! اور ہر بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا ہے!!

بیس برس کا مادھو اور اُس کی ہم عمر بیوی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خود ہی اپنی داستانِ غم حاضرین کو سنا کر یہ قبول کر چکے ہیں کہ اگر ٹھیکیدار نے اُن کو روزگار اور ایک خیمہ نہ دیا ہوتا تو وہ بھوک یا سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوتے! وہ خوش ہیں کہ ان کی بدولت ان کا محسن کچھ پا رہا ہے! بلکہ وہ بھی اپنے مطمئن ہیں کیونکہ ٹھیکیدار سے کیے گئے معاہدے کی رو سے وہ کسی گاؤں میں گھر، زمین، بیلوں کی ایک جوڑی، ایک جرسی گائے، یعنی مال مویشی بھی لے رہے ہیں! گویا وہ سب، جو انہوں نے کھویا ہے! بلکہ اُس سے بھی زیادہ!

یہ سچ ہے کہ میاں بیوی اپنی سہاگ رات کو ہی اکھڑ کر اجڑ گئے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ وہ شب عروس سے پہلے اپنے گاؤں کے مندر میں گئے تھے جب دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کا ایک پل، ندی میں اچانک آئے ہوئے پانی کے تیز بہاؤ سے بہہ کر، ان کو مندر میں ہی رات گزارنے کے لئے مجبور کر گیا تھا! پھر چونکہ آناً فاناً نشیبی سطح پر واقع گاؤں، گاؤں والے، دور دور تک پھیلے کھیت بلکہ درخت بھی پانی میں اپنا وجود کھو بیٹھے تھے، صرف وہی زندہ رہنے میں کامیاب ہوئے تھے! اور چھ دن اور سات راتیں دنیا سے کٹ کر، نہایت دشوار اور عذاب دہ حالات میں گزار چکے تھے!

دونوں کو تب ہیلی کاپٹر کی مدد سے شہر میں لایا گیا تھا! اور دونوں کی دردناک تنہائی میں رہنے کی کہانی حیرت انگیز اخباروں میں شائع ہوگئی تھی! ٹیلی ویژن کی تمام چینلوں پر ان کے انٹرویو دکھائے گئے تھے! لیکن چند دنوں کے بعد ہی وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ میں بھی ویسے ہی الگ تھلگ ہو گئے تھے جیسے وہ مندر میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر تنہائیوں میں رہ گئے تھے! اور پھر نہ گاؤں کا کوئی ذکر کرتا تھا نہ کسی کو یہ جان لینے کی فکر تھی کہ گاؤں کو دبوچ ڈالنے والا مار خور پانی، ڈیم (باندھ) کے جزوی برباد ہونے کی وجہ سے کیوں اور کیسے آیا تھا؟ بحث مباحثوں میں امکانات کا ذکر اچانک یوں ڈوب گیا تھا گویا گہرے پانی میں ایک پتھر! جو لوگ برق کی شکل میں باندھ پر گر پڑا قہر خدا، یا قہر آدم کی شکل میں دہشت گردوں کی کارستانی یا پھر سرکاری ملازموں کی غفلت کے حوالے دیتے رہتے تھے، سب خاموش ہو گئے تھے! گویا میاں بیوی ایک سناٹے میں

نا اُمیدیوں کا بوجھ اُٹھا کر چل رہے ہیں!

چونکہ شادی کے کپڑے پہن رکھے تھے اس لئے میاں بیوی کو مندروں میں پرشاد تو کیا بھیک بھی نہیں ملی تھی اور ایسے حالات میں لکشمی نارائن ٹھیکیدار نے ان کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا!

اُس کی ایک خاص وجہ تھی!

چونکہ لکشمی نارائن ٹھیکیدار کی سوچ اور سمجھ پر اُس کی کاروباری عمل حاوی ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ 'ہو چکے' ہورہے یا متوقع واقعات کے پس منظر میں فقط اپنے نفع یا پھر نقصان کا اندازہ لگانا ایک مقصد نما عادت بن گئی ہے! یعنی اگر برف باری نہیں ہوئی تو......؟، اگر دہشت گردی ختم ہوگئی تو......؟ اس کے علاوہ انعامی مقابلوں میں شریک ہونا اس کا واحد مشغلہ ہے اس لئے اُس کی نظریں ہمیشہ ایسی خبروں یا اطلاعات کی تلاش کرتی رہتی ہیں جن کا تعلق انعامی مقابلوں سے ہوا!

جس دن، نہایت کسمپرسی کی حالت میں، یہ جوڑا اُس سے مدد مانگنے آیا تھا، اُس دن اُس نے ایک دس لاکھ ڈالر کے عالمی مقابلے کی پوری جانکاری حاصل کی تھی! یہ سوچ کر کہ جو جوڑا، نہایت ڈراؤنے ماحول میں، زندہ رہنے کی ہر ضرورت سے محروم ہوتے ہوئے بھی، کسی مددگار کے دلاسوں کے بغیر، رنج وغم اور مایوسیوں کی تاریکیوں میں ڈوبکیاں لگاتے ہوئے، چھ دن تک حالات سے مقابلہ کرسکتے ہیں وہ اپنی جسمانی اور جنسی ضروریات میسر ہونے کی صورت میں، دس دن تک، شہر بلکہ آبادی سے بھی دور ایک برفیلے پہاڑ پر، گنجان جنگل میں، مقابلے کے لئے خاص طور پر بنائے گئے ایک محفوظ گھر میں، تنہا رہ سکتے ہیں! اور اگر وہ مقابلہ جیت جاتے ہیں تو کیوں نا ایک معاہدے کے تحت اس کو وہ دیا جائے جو بھی کو چکے ہیں! اور باقی کی رقم سے اپنے تمام خوابوں کو حقیقتوں میں بدلا جاسکتا ہے!!

بس یہی سوچ کر ایک ٹھیکیدار نے میاں بیوی، دونوں کی، انگلیاں پکڑلی تھیں! چونکہ انعامی مقابلے میں فقط وہ شریک ہوسکتے تھے جو ملتے جلتے حالات میں رہ چکے ہوں اس لئے اُس نے اپنے خرچے پر اخباروں کے حوالوں سے، ٹی وی پر ان کے نشر ہو چکے پروگراموں کو دکھا کر،

ان کو مقابلے میں شامل کروالیا تھا۔

جس روز مقابلے کے لئے، میاں بیوی کو، ایک ہیلی کاپٹر میں لے کر، برفیلے پہاڑ کی اونچی چوٹی پر چھوڑ آگیا تھا، ٹھیکیدار کو بھی، بحیثیت میاں بیوی کے محسن اور قانونی مشیر ساتھ لیا گیا تھا! تاکہ وہ جان پاتا کہ گھر ہر لحاظ سے محفوظ ہے! کیونکہ چھوٹا سا مکان نہ برف کے بوجھ سے دب سکتا تھا اور نہ کوئی تیز رفتار برف کا تودہ گھر کو دبوچ سکتا تھا!

گھر میں بیس دن کے کھانے پینے کا سامان تھا! سردی کا مقابلہ کرنے کی خاطر معقول انتظامات رکھے گئے تھے! بلکہ تفریح کے لئے الیکٹرانک سہولیات بھی میسر تھیں! فلم دیکھی جا سکتی تھی! کوئی بھجن گیت یا قوالی سنی جا سکتی تھی! بلکہ دل بہلانے کی خاطر اور جنسی رجحانات کو تقویت دینے والی نظموں کے کیسٹ بھی رکھے گئے تھے! یعنی ادب کو سوچنے اور سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی!

اور یہ سبھی سہولیات اس لئے رکھی گئی تھیں تاکہ یہ تجربہ کیا جا سکے کہ انسان تنہائیوں میں رہ کر نفسیاتی خدشات کو جسمانی خوف سے زیادہ ڈراونا سمجھ کر، مدد کے لئے صدائیں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ کب تک وہ تنہائیوں میں الگ تھلگ ہو کر، رہ سکتے ہیں!

ایک بہت ہی آرام دہ، چھوٹے مگر بے حد خوبصورت گھر میں موجود سہولیات کے بارے میں منتظمین نے مکمل طور پر جانکاری دی تھی! سہولیات کے استعمال کے لئے وہ تب کچھ بتا دیتے جب مالتی، مادھو یا منتظمین کے ساتھ آیا ہوا اور ان کے ہی ساتھ جانے والا میاں بیوی کا قانونی مشیر اُن سے گزارش کرتا! منتظمین سمجھ بیٹھے تھے کہ میاں بیوی سہولیات کے استعمال سے آشنا ہیں جبکہ ٹھیکیدار کو ان کی ناآشنائی کا اندازہ تھا مگر اس کو یقین تھا کہ دونوں کے لئے ایسے آرام دہ ماحول میں جب وہ موٹے شیشوں سے جھانک کر برف باری کے مناظر دیکھتے دیکھتے، کھا پی کر، ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے تب ساری کائنات سمٹ کر دونوں کی مسکراہٹ بن جائے گی! یہ سوچ کر ہی اُس نے نہ خود میاں بیوی کو ہدایات دی تھیں اور نہ میاں بیوی کو پوچھ تاچھ کرنے کا موقع دیا تھا! ایک مصلحت کے تحت! کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میاں بیوی کو انعام کی رقم کے بارے میں جانکاری ہو! گھر میں ایک فون بھی تھا جو ناظم کے ساتھ جڑا ہوا تھا! یعنی اگر

بات ہو جاتی تو ہر سوال اور جواب ، یعنی مدد طلب کرنے والے اور مددگار کی آواز کوئی اور سن نہیں سکتا تھا! اُس کی بھی ایک خاص وجہ تھی! ہر مدد کی صدا یعنی (Distress call) اُس خوف یا ڈر کی شناخت کر سکتی تھی جو مقابلے میں حصہ لینے والوں کے تذبذب سے اُن کے ارادے کو عزم کی بلندی سے گرا کر ہٹا بھی سکتی تھی! یعنی ہر بار ایک سوال پر رقم کی جزوی کمی ہو جانے کے لئے، مدد مانگنے والے کو تیار رہنا تھا! اس شرط کو ناظم اور ٹھیکیدار دونوں نے قانونی طور پر قبول کیا تھا۔ اگر مدد صحت کے بارے میں ہو، تو اس کو رقم کھانے والی مدد کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا! اُس کی ضرورت بھی نہیں پڑ سکتی تھی کیونکہ منتظمین نے گھر میں دوائیاں بھی رکھ لی تھیں میاں بیوی کی ڈاکٹری جانچ ہو چکی تھی اور حادثوں کے امکانات تھے ہی نہیں! یعنی گھر میں فقط ذی ہوش انسانوں کے لئے نفسیاتی دباؤ کے اتار چڑھاؤ کے امکانات تھے!

منتظمین نے کسی جنگلی جانور بلکہ ڈاین، وَن مانش، یا ایسے دیگر تصوراتی وجودوں کے حملوں کو خارج کرنے کے دعوے بھی کیے تھے! انسانی حملوں یا دہشت گردی کے تحفظ کا بھی یقین دلایا تھا! بلکہ یہ بھی قبول کیا تھا کہ اگر ان کی طرف سے ان کا کوئی دعویٰ غلط ثابت ہوا تو وہ مقابلے کو مکمل قرار دے کر، مقابلے میں شریک جوڑے کو پوری رقم دیں گے!

گویا بقول لکشمی نارائن اگر مالتی یا مادھو مدد مانگتے بھی رہیں تب بھی ایک سمندر کے پانی میں کمی نظر بھی نہیں آ سکتی تھی! جبھی تو اُس نے اِس شرط کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا! لیکن اسی شرط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے پانچویں دن کے اختتام تک انعام کی رقم فقط اسی فیصد کٹ گئی تھی! چھٹے دن صبح جب ٹھیکیدار کو یہ اطلاع مل گئی تھی تب اُس پر گویا برق گر پڑی تھی!

ہوا یوں تھا کہ نئے گھر کے آرام دہ ماحول میں نہ تو ان کو ایک دوسرے کو، چھوٹی چادر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جاگنا پڑا تھا! اور نہ وہ ایک خیمے کے اندر بوجھل آنکھوں کو آہٹ یا چاپ کی آوازیں سن کر کھلی رکھنے کی ضرورت تھی اس لئے وہ پہلی بار کچھ کھائے پیئے بغیر ہی سو گئے تھے! پھر شام کو اچانک چار سو پھیلے سناٹے میں، تاریکیوں کو چیرتی ہوئی، نظر نہ آنے والے جنگلی جانوروں کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ لرز اٹھے تھے! پھر مدد کے لئے پہلی صدا دے چکے تھے!

جواباً ان کو بار بار اور ہر بار یہ بتایا گیا تھا کہ گھر کے اردگرد جو خاردار تار کی دیوار بنائی گئی ہے اُس میں برق دوڑ رہی ہے اس لئے کوئی بھی جنگلی جانور یا درندہ بلکہ اتفاقاً قریب آنے کی کوشش کرنے والا شکاری بھی برق کے جھٹکوں کی شدت سے ڈر کر بھاگ جائے گا!

گویا جو اطلاع ایک بار مل کر باقی سوالات کو خارج کر سکتی تھی، میاں بیوی کی معصومیت اور فوری طور پر مدد نہ ملنے کی وجہ سے ایک سے پانچ مختلف خدشوں کی شکل میں آ گئی تھی جیسے تیار کھانے کے ڈبوں کو کھولنے کے لئے، ڈبوں کو گرم کرنے کے طریقوں کے بارے میں، یا ویڈیو دیکھنے کے بارے میں وہ ایک مدد سے جڑے ہوئے کئی سوالات پوچھ پوچھ کر مدد مانگ کر وہ ناظم کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے انعام کی رقم کو کم کرتے رہے!

دراصل ناظم کے نہایت نرم رویے میں میں دیے گئے جوابات میں دونوں کو مسیحائی تاثرات محسوس ہوتے رہے! بلکہ وہ خود ہی ناظم کو یہ بتا چکے تھے کہ جب وہ مندر میں پھنس گئے تھے تب وہ بھگوان سے مدد مانگتے رہتے تھے! ناظم ان کی کیفیت بھانپ کر بھی، معاہدے کی شرائط کے تحت روک ٹوک نہیں سکتا تھا!

اُس روز ٹھیکیدار کو اپنی غفلت کا احساس تو ہوا تھا مگر کر پاتا!

وہ ٹوٹے دل سے دعائیں کرتا رہا کہ میاں بیوی ناظم سے مدد نہ مانگ لیں! اور کوئی ایسا کرشمہ ہو جو رقم ایک لاکھ ڈالر سے کم نہ ہو جائے! ورنہ معاہدے کے مطابق اُس نے جو میاں بیوں کو دینا ہے اس کے لئے اس کو اپنے اثاثے بیچنے پڑیں گے! کہیں اُس کو لینے کے دینے نہ پڑیں!؟

لیکن بھگوان نے اس کی فریاد سن لی اور ناظم نے ساتویں دن مقابلے کو ختم کر کے میاں بیوی کو ٹھیکیدار کے سپرد کر دیا ہے اور ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا یقین دلایا ہے!

آج اُس نے اپنے بینک سے، اپنے بھٹے کے لئے قرضے کی رقم کو، مکمل طور پر نکال کر، چیک لینے کی تقریب کو رنگین بنانے کے لئے، خرچ کئے ہیں! یہ سوچ کر کہ رقم توقعات سے بہت کم ہے مگر لاگت کے حساب سے بہت زیادہ!

ایک طویل انتظار کے بعد ناظم آ چکا ہے! اس کے ساتھ پولیس ہے اور پولیس کی

گرفت میں، آنکھوں پر کالی پٹی باندھے ہوئے ایک نوجوان ہے جو چلا چلا کر یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایک سڑک چھاپ غنڈہ ہے کوئی دہشت گرد نہیں ہے! اُس نے ایک اجنبی کے کہنے پر دس ہزار روپے لے کر، اُسی کا دیا ہوا ایک بارود کا ایک گولہ، اُسی کی دکھائی گئی جگہ پر، پھینک چکا ہے!

پولیس نے نوجوان کے دعوے کو اُس صورت میں قبول کرنے کا یقین دلا چکی ہے اگر وہ اجنبی کو پہچان سکے!

ناظم تذبذب میں ہے کیونکہ اگر نوجوان ایک دہشت گرد نہیں ہے تو ٹھیکیدار کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے تحت وہ ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا پابند نہیں ہے! گویا حالات کی کروٹ ایک متاثر کن واقعے کو جنم دے سکتی ہے۔

اچانک قریب سے نوجوان کو پہچان کر، اُس کی آنکھوں سے پٹی ہٹانے سے پہلے، یعنی اپنی شناخت کرنے سے پہلے ٹھیکیدار اپنے ہی بوجھ سے زمین پر گرا پڑا!



کیوں؟

اُس کے کاروبار کسی نے کسی وجہ سے ڈوبتے رہتے ہیں اس لئے ایک اور ناکامیابی سے وہ مایوس نہیں ہے بلکہ اس بار وہ اپنے دس برسوں سے چل رہے کاروبار کے اچانک بند ہو جانے سے خوفزدہ ہے! کیوں کہ اچانک دوپہر کے آفتاب کو گویا مکمل گرہن نے دبوچ کر اُجالوں کو دبوچ ڈالا ہو! یا پھر راتوں میں تاریکیوں کو چیرنے والی روشنیوں کو ایک گرڈ (Grid) پاور ہاؤس میں موجود ایک سوئچ (Switch) دبا کر چھین لیا گیا ہو! جو بھی ہوا ہو! کیوں؟

اس کے کاروبار آج تک یوں بند نہیں ہوئے ہیں! کوئی کاروبار ایک دمے کے مریض کی طرح گھٹ گھٹ کر دم توڑ گیا تھا! کوئی کاروبار ایک مچھلی کی طرح پانی میں رہ کر بھی، شکاری کے کانٹے میں پھنس کر، اُچھل اُچھل کر دم توڑ گیا تھا! وہ ہر بار یہ تو جان پایا تھا کہ بربادی کے وجوہات کیا تھے! کبھی درآمد اور برآمد کے گردابوں کے اثرات! کبھی عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں کے اثرات! کبھی سرکاری پالیسیوں، بجلی کی قلتوں، کبھی سیاسی یا تنظیمی سمجھوتوں، کبھی ہڑتالوں کے دباؤ یا بھاری بوجھ کے تاثرات!

بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے سے گریز کرتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ بہت ہی چھوٹے پیمانوں پر کاروبار کرنے کا عادی ہو چکا ہے! دراصل وہ اپنے کروڑوں کی آمدنی کا ایک حصہ ایک مقصد کے لئے داؤ پر لگانے کی عادت اپنا چکا ہے! جن لوگوں کو وہ اپنے کاروبار کی بدولت روزگار مہیا کر دیتا ہے وہ عالمی سطح پر معروف وجے کمار کو بصد احترام کرانتی کمار کے نام سے مشہور ہے، جبکہ عالمی کاروباری دائروں میں موجود اُس کے ہم عصر اُس کو طنزاً یا حوصلہ شکن ارادوں سے ''نام

نہاد کرانتی'' کے نام سے جانتے ہیں! بقول اُن کے وجے کمار پچھلے پچاس برسوں سے سستی شہرت پانے کی خاطر نت نئے کاروبار شروع کرتا رہتا ہے تو انکم ٹیکس کی بچت کے علاوہ خبروں میں چھائے رہنے کی خاطر! اس لئے اُس کے مشہور قول واور عمل کو بطور ''مکاری کے نمونے'' ایک دوسرے کو سنا کر، اُس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں! جبکہ اس کے ہر کاروبار میں شام لوگ اس کی باتوں کو معنی خیز سمجھتے ہیں! گویا وہ اُس کی خوبیوں میں خامیوں کے کیڑے تلاش کرنے کے عادی نہیں ہیں! بلکہ وہ اُس کے قول اور عمل کی خوشبو سے متاثر ہونے کے عادی ہیں! جبکہ وجے کمار اپنے آپ کو اپنے نام سے ہی پیش کرنے کا عادی ہے! اور چاہتا ہے کہ گھر میں بار بار گھسنے والے سانپ کو پکڑنے کے لئے ہر بار ایک جان پہچان کے سپیرے کو بلانے سے اچھا ہے کہ ایک بار خود سانپ کو پکڑا جائے، بھگایا جائے یا پھر کچلا جائے! تاکہ یہ جانا جا سکے کہ اپنے پالتو سانپ کو گھروں میں ڈالنے والا وہ سپیرا ہی تو ہے جو چھپ کر گھستا ہے اور گھس کر قابض ہو کر اپنی منصوبہ بندی کی ایک اہم کڑی بنا لیتی ہے!

بقول اُس کے چائے میں دودھ ڈالنے سے چائے کا رنگ جبکہ شکر یا نمک ڈالنے سے اُس کا ذائقہ بدل جاتا ہے! گویا ملاوٹ سے چائے کی اپنی خوبیاں اور خامیاں چھپ جاتی ہیں! اس لئے کیوں نا ملاوٹ سے اور دکھاوٹ سے ارادوں کو پارک رکھا جائے!

چسکہ لگ جائے تو نشے کی لت بن جاتا ہے! بند بوتلوں میں مغرب سے درآمد کیا گیا مشروب پینے سے اچھا ہے کہ اپنے کھیتوں میں اُگائے گئے گنے کا رس پیا جائے! یا پھر نیمو کا رس چوسا جائے! ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر خود غرض دوستوں سے اُدھار لیا جائے یا پھر کسی ساہوکار سے بلکہ چھوٹے بڑے بینکوں یا عالمی بینکوں سے قرصے لیے جائیں تو سود یا سود در سود کے ساتھ لوٹانے ہی پڑتے ہیں! لینے والے کی خودکشی کرنے کے بعد بھی! کیوں نا ٹانگیں اُتنی پھیلائی جائیں جتنی کہ چادر لمبی ہو! بلکہ چادر میلی ہو تو دکھاوٹ کے لئے بناوٹ اچھی منصوبہ بندی ہو ہی نہیں سکتی!

وجے کمار ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اولاد ہے! کالج کے زمانے سے وہ اپنے باپ کی صحبت میں رہ کر کاروباری نبض دیکھنے میں مہارت حاصل کر چکا ہے! وہ پچاس برس پہلے لندن

حشر

آخر میں جان گیا کہ نیا باغبان کیا کرنے آیا تھا۔ حیران تھا کہ بچپن سے میری دیکھ بھال کرنے والے باغبان کو کیوں نکال کر یہ اجنبی اس گلستان و بوستان میں داخل ہو گیا تھا!

ہمارے ہاں کہاوت ہے کہ کسی چیز، اصول، خیال، عمل کو بدلا جانا چاہیے جب پرانے میں کوئی خامی ہو اور نئے میں کوئی خوبی ہو۔ اب کس میں خامی تھی اور کس میں خوبی یہ میں جان نہیں پایا تھا۔ لیکن اب!؟......!!

یہ سب کیوں ہوا، کب ہوا اور کیسے ہوا یہ ایک راز بن کر خزاں آلودہ پتوں کی ہوا کے جھونکوں سے شاخ سے جدا ہوتے ہی بکھر کر یا تو کیچڑ میں دب گیا تھا یا کسی ندی میں بہہ کر سڑ گیا تھا یا پھر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ مگر قدرت نے اپنا کرشمہ دکھایا تو میں راحت کا سانس لیا۔ میری تقریباً تمام شاخیں کاٹ کر جن چند شاخوں پر اُس نے پیوند لگا کر اُگایا تھا اُس کے پتوں کا رنگ روپ اور بو عطر کی طرح کاغذی پھولوں سے اُڑ کر اپنی اصلی صورت میں نظر آ گئے اور مجھے دیکھنے آئے لوگ دنگ رہ گئے۔ نئے باغباں کا کرشمہ منظر عام پر نہ آیا تو اُس نے خود ہی اپنی پیوند کی گئی شاخوں کو کاٹ کر سیاست کی آڑ میں اپنا بچاؤ کرنا چاہا۔ مکاری اور جھوٹ کی چاشنی ملا کر! وہ شاید کامیاب بھی ہو جاتا اور لوگ یہ مان بھی لیتے کہ سرکار نے ایک مہم کو نہ کامیاب بنانے کے لئے درخت کی جڑوں میں کوئی کیمیائی کھاد ڈال دی تھی اور میں حالات کا شکار ایک بے زبان درخت، حالات کا اکلوتا چشم دید گواہ بھی واقعات پر روشنی ڈال نہیں پاتا مگر قدرت کے ایک کرشمے نے شیطان کے چہرے کو عیاں کر دیا۔ یوں سمجھنے والے حالات کو دیکھ کر واقعات کو سمجھ پائے! اور پھر

جب ایک بزرگ خدا دوست نے جڑوں کو دیکھ کر کہا کہ موسم بہار کا انتظار کیا جائے تا کہ یہ جان لیا جائے کہ جڑوں میں اگر زہر ڈالا گیا ہو تو نہ کوئی نئی شاخ اُگ پائے گی اور نہ کٹی ہوئی شاخوں پر کونپلیں نظر آئیں گی۔ سمجھ دار بہکاوے میں نہ آکر بہار کا انتظار کرتے رہے۔

بہاریں آگئیں اور موسم کی رنگت وخوشبو میں لوٹ کر آئی اور چار سو پھیل گئی۔ نیا باغبان یہ دیکھ کر سرحد پار کرتے ہوئے دلدل میں دھنس کر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے آقاؤں کی نظروں کے سامنے زندہ دفن ہو کر مر گیا اور میرا شک یقین میں بدل گیا، یہی کرنے آیا تھا خود ساختہ باغبان۔ اور یہی میں جان چکا ہوں! اور لوگوں کی طرح! مقابلہ تھا برابری کا۔ وہ تھی قیامت یہ حشر ہوگا!!



بس ایک لمحہ

آج کی صبح نرالی ہے اور سہانی بھی!

آج جج صاحب کی آنکھیں کانچ کے ٹکروں کی مانند بے جان سی نظر نہیں آرہی تھیں بلکہ ان میں چمک ہے۔ شاید اس لئے کہ ان میں مشاہدے کی قوت لوٹ آئی ہے اور وہ بڑے اشتیاق سے نیلے آکاش میں تیر رہے بادلوں کے ٹکروں کو دیکھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اسپتال کے کمرے کے ساتھ والے برآمدے میں اپنی بیوی کو بادلوں کے ٹکروں سے بنتی بگڑتی شکلیں دکھا کر کہہ رہا ہے کہ وہ بھی اس کے چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے کی بجائے بادل کے ٹکروں کو غور سے دیکھ لے تاکہ وہ بھی کبھی بندر، کبھی ہاتھی، کبھی شیر، کبھی دودھ پلا رہی ماں اور ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اچھلتے ہوئے بچے کو دیکھ لے۔ یہ جج صاحب کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا جو تقریباً دو سال پہلے چھوٹ گیا تھا، آج ان کے چہرے پر تناؤ کے اثرات تھے اور نہ کسی قسم کا تجسس یا اپنے اِرد گرد اپنے ہی گھر والوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کا تذبذب۔ سانسیں راحت کا احساس یوں دلا رہی ہیں گویا ایک عذاب وہ پھوڑا خود بخود پھٹ چکا تھا اور تکلیف وہ پیک ایک لمحے میں نکل کر ایک اذیت ناک دور کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ بیوی یہ دیکھ کر سوچ رہی ہے کہ کاش یہ کرشمہ تھانے میں ہوا ہوتا تو گھر کی بات گھر والوں تک ہی محدود رہ پاتی۔

جو بھی بُرا یا اچھا ہونا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔

ایک پڑھے لکھے بزرگ کی غیر شائستگی اور انگریزی میں غیر مہذب جملوں کا استعمال کسی کو بھی اُکسا کر سخت اقدام لینے کے لئے مجبور کر دیتے۔ خاص طور پر تب جب وہ اپنی ہی

بیوی کے خلاف آگ اُگل رہے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ پولیس نے ایک عجیب گیٹ اپ میں ایک شخص کو ایک پارک میں بدیشی سیاحوں سے کسی موضوع پر انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا تو رسمی پوچھ تاچھ شروع کی تھی تو جھاڑیوں کے پیچھے ایک بزرگ عورت کو بناوٹی جوانی کا لبادہ پہنے دوڑ کر جج صاحب کے بچاؤ کے لئے کھان سے نکلے شیر کی طرح پولیس والوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ کہہ گئی کہ جج صاحب ان کے شوہر ہیں مگر جج صاحب انکار، احتجاج اور پھر عورت کو ایک اجنبی بازاری عورت کہہ کر اس پر ورغلا کر لے جانے کی خاطر اس کا گھر سے پیچھا کرنے والی چڑیل کہہ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا اس لئے پولیس نے دونوں کو مشکوک کردار سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا۔ عورت نے اپنے موبائل فون سے بات کرنی چاہی تو کوئی حالات کا فائدہ اٹھا کر اس کا فون چھین کر بھاگ گیا تھا۔ تھانے دار نے جب دونوں کو تھانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو دونوں کا حلیہ دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

جج صاحب نے ایک جدید فیشن کا کرتا پہن رکھا تھا اور وہ یوں نظر آ رہا تھا گویا ایک موٹے تکیے پر ایک تنگ غلاف چڑھا دیا ہو۔ ایسا ہی اس کی ٹانگوں پر ایک بہت ہی تنگ جینس (Jeans) میں لگ رہا تھا۔ عورت کی تو اس سے بھی بدتر حالت تھی۔ بے چمک سفید بالوں کو ایک ماڈرن اسٹائل میں سجایا گیا تھا۔ پچکے گالوں پر گلابی پچ، سوکھے اندر دھنسے ہوئے ہونٹوں پر لپ اسٹک (Lipstick)، سوکھے تالاب جیسی آنکھوں میں کاجل اور پھر ایک تنگ جیکٹ سے باہر آئے اس کے پستان جو دو پروں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے، سفید کبوتروں کی طرح چھو کر باہر ایک لمس کی دعوت دینے کی بجائے آزاد رہنے کی فریاد کر رہے تھے۔

اپنی غیر سنجیدگی پر قابو پا کر جب تھانیدار نے بیان قلم بند کرنے سے پہلے سسک رہی عورت سے پوچھ تاچھ کرنی چاہی تو وہ سسک سسک کر ہر سوال کے جواب میں التجا کرتی رہی کہ وہ اپنے بیٹے کو فون کرنے کی اجازت دے۔

تھانیدار نے نمبر دیکھا تو ممبئی کے ایک پاش (Posh) علاقے کا نمبر تھا اس لئے اس نے اپنائیت کا احساس دلا کر کہانی کرید کرید کر جان لی۔

جج صاحب ایک نہایت ہی قابل سیشن جج تھے جو سبکدوش ہونے کے بعد ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے وہ بھی نیویارک میں جہاں وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس گئے تھے۔

جج صاحب منصف بن جانے کے بعد بہت کم بولتے تھے اور صبح سویرے سیر پر جانے سے پہلے کسی دیوی دیوتا کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر پوجا پاٹ کرنے کی بجائے ایک آئینہ سامنے رکھ کر اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے تھے اور عہد کیا کرتے تھے کہ جو بھی آج کروں بھگوان کو حاضر ناظر رکھ کر سچ کی بنیاد پر کروں۔ یہ عادت تب تک جاری رہی جب تک وہ ایک بھیانک حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے اور گھر والوں کو ان کی یہ عادت چھوٹ جانے سے اس حقیقت کی تصدیق ہو گئی تھی کہ گھر میں رہ کر بھی اپنے گھر والوں کو اجنبی سمجھ کر بار بار یہ کیوں پوچھ لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ بلکہ وہ اجنبیوں سے نہایت گرم جوشی سے ملا کرتے تھے۔ حال چال یوں پوچھ لیا کرتے تھے گویا برسوں سے ان کو جانتے تھے مگر اچانک بات چیت کا سلسلہ روک کر یہ پوچھ کر ہم کلام پر برق ڈال دیا کرتے تھے کہ بائی دی وے (By the way) آپ کون ہیں؟ کچھ تو ایسے بھی تھے جو ایک بزرگ کا انداز بیان سمجھ کر لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر گھر والوں کے لئے ان میں ایک بدلے بدلے انسان کو دیکھ کر دہشت ہوا کرتی تھی۔

جج صاحب لڑکپن سے آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھا کرتے تھے۔ پھر کالج کا ایک رومانی ہیرو گھر سے نکل جانے کے بعد اور لوٹنے کے بعد آئینہ دیکھا کرتے تھے۔ پھر سمجھ دار لوگوں کو یقین تھا کہ لڑکا نرگسیت کا شکار ہے یعنی اپنی ہی صورت پر فدا یا عاشق ہونے والا شخص (بحوالہ ایک یونانی کہانی) ہے جب کہ عام لوگ ایسی عادت کو عیب کا نام دیا کرتے تھے۔

جج صاحب کے ذہن میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں، رشتے ناطے بلکہ ساتھ رہنے والے لوگ اور ماحول بھی سب کچھ ایک خواب کی مانند ہوا کرتا تھا، یعنی پلکیں کھلنے سے بند ہونے تک ہی سامنے رہا کرتا تھا۔ امریکہ میں مقیم ان کے بیٹے علاج کے لئے والدین کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئے مگر یہ جان کر کہ وہ اجنبی چہروں کے چنگل میں ڈرے ڈرے سے رہا کرتے تھے اس لئے ان کو ممبئ میں ان کے دوسرے بیٹے کے پاس بھیج دیا۔

ممبئ میں ان کو یہ فائدہ ہوا کہ گھر میں نوکر چاکر تھے، ڈرائیور ان کو کار میں دن بھر گھمایا

کرتا تھا، وہ اگر کسی اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑتے تو کار روک کر ان کو بات کرنے کا موقع دیا جاتا تھا، مگر ہر بار ایک نہایت خوش گوار ملاقات اسی جملے پر ختم ہو جایا کرتی تھی ”By the way آپ کون ہیں؟“ گویا کسی یگانے یا بیگانے سے جج صاحب کا خود ملنا یا ملوانا بار بار ایک مذاق یا پھر ایک صدمہ بن جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹروں کے ہی مشوروں پر ایک کمرے میں قد آدم آئینہ رکھ دیا گیا تاکہ کسی آئینے میں جج صاحب کی نرگسیت کی کونپلیں پھوٹ کر آ جائیں اور وہ اپنی کھوئی یادداشت کو آوازیں دے کر بلا سکیں! اس کے علاوہ ان کے سامنے ماضی کے قصے اور واقعات سنائے جاتے بلکہ پرانے البم دکھائے جاتے۔ گھر کا ہر فرد کچھ نہ کچھ سناتا رہا اور اسی کوشش میں بیوی نے اپنی شادی کی تصویریں دکھائیں، جس سے امید کے اشارے دیکھنے کو مل گئے۔

ایک منصوبے کے تحت بیوی، جج صاحب کو اپنے پوتے کے کپڑے پہنا کر ایک پارک میں چھوڑ آئی جب کہ خود اپنی پوتی کے کپڑے پہن کر ایک جوان لڑکی کے گیٹ اپ (get up) میں وہ منظر دُہرانے کی کوشش کرنے کی تیاری کرنے لگی۔ منظر کو دُہرانا مشکل تو نہیں تھا۔ دونوں کی ٹکر ہونی تھی جس کی وجہ سے ایک بے حد خوبصورت سولہ سال کی لڑکی کے گاگلز (دھوپ کا چشمہ) گر کر چکنا چور ہو گیا تھا اور اور بیس سال تک قانون کی پڑھائی کرنے والے لڑکے کی نظریں لڑکی کی پُرکشش آنکھوں میں اپنی صورت ویسی ہی نظر آتی تھی جیسے وہ آئینے میں اپنا خوبصورت چہرہ دیکھا کرتے تھے۔

اور یوں پچاس سال پہلے ایک لڑکی کی آنکھوں کی آگ پر گویا برف پڑ گئی تھی۔ چاہت کا جذبہ اُبھر کر آتے ہی محبت کی لہریں بن کر عشق کی سہانی آنچ بن گیا۔

امید تو تھی کہ تجربہ کامیاب رہے گا مگر ہوا اس کے برعکس۔

جج صاحب تھانے سے لوٹ کر آئے تو آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ کر چلانے لگے۔ کون ہے تو؟ اور لرزش کی وجہ سے وہ پیچھے جاتے ہوئے اپنا توازن کھو کر گر پڑے فرش پر گرتے ہی ایک زور کی آواز دوسرے کمرے میں سنائی دی۔

چند روز بعد جج صاحب اسپتال میں اپنے کمرے کے برآمدے میں چائے کی

چسکیاں لیتے ہوئے اپنی بیوی کو نام سے آواز دے کر کہنے لگے ’’ آئینہ ایک کیمرہ نہیں جو تصویریں کھینچ سکے اور ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ آئینوں میں پانی کی طرح عکس نظر آتے ہیں مگر پانی بہہ کر عکس اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ میں تمہاری آنکھوں میں اپنے تاثرات کے عکس دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موٹر سائیکل والے کا نمبر مجھے یاد ہے لیکن بتاؤں گا نہیں کیوں کہ حادثہ میری غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ بے قصور ہے۔ سزا تو مجھے ملنی چاہئے۔‘‘

بیوی خوشی سے اچھل پڑی اور موبائل کا جونہی بٹن دبانے لگی تو جج صاحب نے ٹوکا ’’کہاں کا نمبر ملا رہی ہو، نیویارک یا ممبئی کا؟ کہیں تم نے ان کو میرے حادثے کے بارے میں کچھ کہا تو نہیں؟‘‘

بیوی کا چہرہ اُتر گیا اور وہ خیالات، احساسات، جذبات اور خدشات کے دائروں میں سمٹ کر ایک گرداب میں پھنس گئی، اس لئے کہ اگر وہ سب ایک سال سے ہو رہے عذاب شدید کے بارے میں بتا دے تو شاید جج صاحب کی یادداشت پھر چلی جائے۔

آئینے کی آڑ میں اس نے اپنی پھول رہی سانسوں پر قابو پا کر کہا’’ ہاں آئینہ جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ پوچھ آئینے سے کہ کیا حادثے کے بعد آپ نے کہا تھا کہ ممبئی فون کر و تا کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر میرا یہاں علاج کروانے کی بجائے آ کر ہمیں ممبئی لے جائے! بلکہ ضد بھی کی تھی، بچوں کی طرح!!

جج صاحب گھنٹہ بھر آئینہ دیکھتے رہے اور پھر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھیں، پچکے گال اور اپنے سفید چھوٹے چھوٹے بال دیکھ کر پہلے مسکراتے رہے اور پھر جب بے ساختہ ہنسی قہقہوں میں بدل گئی تو اپنے قہقہوں کی بے پَر کی پَر بولتے رہے۔ ’’تم بوڑھی ہوگئی ہو، پھر بھی یادداشت تروتازہ ہے۔ میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں مگر یادداشت خزاں آلودہ ہے۔ یاد ہی نہیں آ رہا کہ میں کیوں ممبئی آنے کی ضد پر اڑا رہا۔ شاید بوڑھاپے میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔‘‘

میاں بیوی قہقہے لگاتے رہے مگر بیوی کے قہقہے کھوکھلے تھے! کیوں کہ وہ شاد بھی ہے! اور ناشاد بھی!! وہ جان چکی ہے کہ اس کے شوہر کی یادوں میں دو سال کا عرصہ گویا ڈھل گیا ہے!



کروٹ

غیر متوقع واقعات سے ابھرے حالات، دانش مند منصوبہ بندی سے ایک کروٹ لے کر، حیرت انگیز نتائج دے سکتی ہیں، یہ اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا! یعنی اُس کا اکھڑ چکا اینٹوں کا بھٹہ، آج موسم بہار کی مانند چہکتا نظر آئے گا! ایسا اُس نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا!

دراصل جب سے ایک رات کی غیر متوقع تیز بارش نے اس کی لاکھوں کچی اینٹوں کو کیچڑ میں بدل کر اُس کا بھٹہ بٹھا دیا ہے وہ ایک زبردست اقتصادی بحران کا شکار ہو چکا ہے! بینک سے قرض لے کر وہ بحران پر قابو پانے کی کوشش کر رہا مگر چند ہفتوں کے دوران ہو چکی کارکردگیوں کے نتائج کی آہٹ سن کر، اُس نے تمام کچی اینٹوں کو زمین پر بچھا کر، ان پر ایک استقبال کے لئے قالین بچھا دیے ہیں! سائبانوں سے سجا کر، اُس کا بھٹہ آج سج دھج کر آج ایک ایسے مہمان کا انتظار کر رہا ہے جو اُس کو ایک لاکھ امریکی ڈالر، بطور ایک عالمی مقابلہ جیتنے کی رقم کا چیک دینے آ رہا ہے! اور یوں اُس کو وہ خوشیاں دے رہا ہے جو اُس نے اپنے تیس برس کے استقبال کے لئے ایک رنگا رنگ تقریب کا اہتمام کیا ہے! شہر کے معزز شہریوں اور اعلیٰ سرکاری افسران کے علاوہ میڈیا والوں کو بھی مدعو کیا ہے۔

تقریب میں وہ جوڑا بھی شامل ہے جس نے اُس کے نمائندوں کے طور پر مقابلے میں حصہ لے کر رقم جیت لی ہے! حالانکہ کی بے وقوفی اور شرائط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے انعام کی رقم اسّی فیصد حصہ، کٹ چکا ہے پھر بھی لکشمی نارائن نام کا ایک ٹھیکیدار یعنی جوڑے کا محسن دونوں کو، بطور دولت کی دیوی لکشمی اور بھگوان نارائن، متعارف کر رہا ہے اور خود کو ایک احسان

سے ایم بی اے بھی کر چکا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اگر دوسرے میدانوں میں تعلیمی تربیت اثر انداز ہو سکتی ہے تو کاروبار میں کیوں نہیں؟ ظاہر ہے کہ ہر ذہین انسان تجربے کر سکتا ہے! اس لئے وہ تجربے کرتا رہتا ہے! ایک تخلیق کار بن کر وہ اپنے ہر کاروبار کو شروع کرتا ہے! کامیابی کی توقعات کی اُمید کے ساتھ مگر، ناکامیابی کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنے کی خاطر!

اپنے ایک دوست کی زکوٰۃ سے غریب پڑوسی بھی عید کی خوشیاں سمیٹتے رہتے ہیں مگر وہ کبھی یہ جان نہیں پاتے ہیں کہ نام نہاد دوست کی خیرات میں دی گئی لاکھوں کی رقوم سے اُن کے اِرد گرد پھیلی اقتصادی تاریکیوں کو دکھاوے کی دیوالی دبوچ لیتی ہیں یا نہیں؟ وہ سوچ سمجھ کر ہر سال خود غریبوں کو کپڑے، اناج دیتا رہا! رفتہ رفتہ بے روزگاروں کو اپنے کاروباروں میں شامل کرتا رہا! ایک بند ہو جایا کرتا تھا تو دوسرا کاروبار شروع کر دیا کرتا تھا! مگر ویسے کاروبار جس میں انسانی وسائل ہی اثر انداز ہوں! جیسے کھیتی باڑی کے پانی یا بجلی قلت کی وجہ سے بند ہوتے ہی وہ بھینسوں کی پرورش کر کے دودھ، گوشت، چمڑے کے جیسے کاروبار شروع کرتا رہا! مقصد یہ کہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں ان کی اپنی کاوشوں سے پوری ہوں!

وجے نے امریکہ میں ایک انعام یافتہ دستاویزی فلم دیکھ لی تھی! فلم میں بھوکے انسانوں کو، ایک پانچ ستارہ ہوٹل سے پھینکے گئے جھوٹے کھانے کو، پرندوں کی طرح کرید کرید کر یا جانوروں کی طرح پنجے مار مار کر، کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا! یہ سوچ کر کہ بھوکے انسانوں کی بے بسی اور لاچاری کو جب ایک فلم کار نے اپنے کاروبار میں شامل کیا ہے تو پھر وہ بھی تو ان کو اپنے ایک نئے کاروبار میں شامل کر سکتا ہے! وطن لوٹ کر، جب اُس کا عام لوگوں سے کرایا گیا مرغیاں پالنے کا کاروبار ناکامیابی کے دلدل میں دھنس چکا تھا اُس نے پہلی بار ایک انوکھے کاروبار کی شروعات کی تھی! فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کرنے والے، خاص طور پر پانچ ستارہ ہوٹل کے بغل میں، دادا لوگوں کو رقوم دے کر، ہوٹل کے باہر پھینکے گئے کھانے کا شرف حاصل کرنے والوں کو وجے کمار نے لفافے دیے تھے! اُس میں بھرے چنے کھا لینے کے بعد ان سے ہی لفافوں میں جھوٹا کھانا ڈال کر، دادا لوگ ایک طے شدہ رقم لے کر وجے کمار کے نمائندوں کو دیتے رہے! شروع شروع میں اُن لفافوں کو پولٹری فارم والوں کو مفت دیا گیا تھا لیکن ایک سال بعد

جب کاروبار جڑیں پکڑ گیا تھا پھر مخصوص چارہ بنا کر قیمتاً دیا جانے لگا تھا! گویا لفافوں کے بدلے لفافے عام لوگوں کی پیٹ بھرنے کی ضروریات پوری کرنے لگا تھا! ایک معقول سلسلہ تھا جس میں ہوٹل میں کام کرنے والے، فٹ پاتھوں پر رہنے والے اور داداگیری کرنے والے، سبھی کا اپنا اپنا کام ایمانداری سے ہو رہا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دس برس کے سفر کے دوران بڑے بڑے شہروں، چھوٹے شہروں، ملک بھر کے تمام قصبوں کے چھوٹے بڑے ہوٹلوں، ڈھابوں سے جھوٹا کھانا، مرغیوں کے لئے چارہ بنانے والوں کو ملتا رہا! بلکہ شادی بیاہیوں کا جھوٹا کھانا بھی چارہ بنانے والوں کو ملتا رہا! لیکن اپنے عروج پر پہنچا یہ کامیاب کاروبار اچانک بند ہو چکا تھا!

تحقیق کرنے کے بعد آج وجے کمار عرف کرانتی کی، یا نام نہاد کرانتی کمار کاروبار کے بند ہونے کی وجہ جان چکا ہے!

کسی مغربی کمپنی نے ملک بھر کے جھوٹے کھانے کو خریدنے کے حقوق خرید لیے ہیں!

مگر کس نے کس کو حقوق دیے! اور کیوں؟

کیا کمپنی مرغیوں کا چارہ بنا کر برآمد کرنے جا رہی ہے یا ڈھاکے کی ململ کی طرح ملک بھر کے صارفین کے لئے درآمد کرنے کا منصوبہ بنا چکی ہے؟ اپنے خوبصورت اور بے حد قیمتی ڈبوں میں ڈال کر؟

اور سب سے اہم یہ کہ کمپنی کیا پالتو مرغیوں، پرندوں، جانوروں کے لئے چارہ بنا رہی ہے یا انسانوں کے لئے کوئی لذیذ ضیافت یا خوشبودار قیمتی مشروف؟

یہ سچ اُس کے ہم عصر یقیناً جانتے ہوں گے!

مگر وہ یہ جان نہیں پایا ہے!......!! کیوں؟



مہمان

اماں جی عرف مالکن جی کے اِرد گرد مہمان ہوں اور وہ ایک اچھی میزبان بن کر سب کی خواہشیں اور فرمائشیں پوری کرتی رہے! بس یہی اُس کی خواہش ہے! جب پوری ہو جاتی ہے تو وہ بے حد خوش رہتی ہے! بصورت دیگر اُس پر ایک نرالی کیفیت طاری ہو جاتی ہے! بے قراری کے عالم میں وہ گھر کے ہر کمرے میں جھانک جھانک کر کسی کی تلاش کرتی رہتی ہے، اور جب کوئی نہیں ملتا ہے تب وہ اپنے کمرے کے اندر، ایک کولہو کے بیل کی طرح چکر لگاتے ہوئے، بار بار دروازے کو دیکھ دیکھ کر، چند اشعار گنگناتی ہے مثلاً ''وفائیں کتنی ہی مستقل ہوں جفا کے خوگر جفا کریں گے''! ''جفا کرنے والو! وفا کرنا سیکھو! وفا کرنے والوں سے کیوں آتا رہتا ہے؟! وفا کرنے والے کیا مجھے پہچان لیتے ہیں؟ یا میں ہی ان کی شناخت کر لیتی ہوں؟ کیا ہم ایک دوسرے پر، کرم کرتے ہیں؟ یا ایک دوسرے سے رحم کی امید رکھتے ہیں؟ کہیں ہم ستم تو نہیں کرتے رہتے ہیں ایک دوسرے پر؟

اپنی ہی دھن میں رہنے والی اس بوڑھی عورت کو اپنی سوچ سمجھ، قول اور عمل سے جڑے اپنے ہر اختیار پر اعتبار ہے! دوسروں کے دیے گئے اختیارات پر نہیں! اور یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر والوں کے لئے بھی ''اماں بی'' کی بجائے ''مالکن جی'' ہے! اور اسّی برس کی عمر میں بھی اس کا ہر دن ایک 'نیا دن' نہیں ہوتا ہے! بلکہ 'ایک اور دن' ہوتا ہے!! جو گزر چکے دن، پانچ دن پہلے، پانچ ہفتے پہلے، پانچ مہینے پہلے، پانچ برس پہلے یا پچاس برس پہلے گزر چکے دن جیسا ہوتا ہے! یعنی میزبان اور مہمان یا مہمانوں کے درمیان رشتوں کی ایک جیسی کہانی جو حساس، مگر دی ہوش

لوگوں کے لئے، سنسنی خیز نہ سہی حیرت انگیز موضوع بن جاتی ہے یا بن سکتی ہے؟ کیوں کہ اماں جی عرف مالکن جی اپنے آپ کو''مالکن'' جی سمجھ کر ایک بہت اچھی میزبان بن جانا ہی اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتی رہتی ہے! اس لئے وہ گھر آئے ہر مہمان کو بھگوان کا رتبہ دے کر اُس کا استقبال کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے! سحر سے شام تک اور شام سے سحر تک، ہر موسم میں، اپنے دروازے پر بجائی گئی گھنٹی کی آواز بلکہ دستک یا کتے کے بھونکنے کی آواز سنتے ہی وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح نشانے پر رُک کر، دروازہ کھول دیتی ہے! ملاقاتی کوئی بھی ہو! بچہ بوڑھا یا جوان ہو! نر ہو یا مادہ ہو! چوکیدار ہو یا دودھ والا ہو! اخبار والا ہو یا کوئی شناسا چہرہ ہو! مالکن جی سب کو معنی خیز نظروں سے ان کے چہروں پر اُبھرے تاثرات کو دیکھ کر پوچھتی رہتی ہے! کس سے ملنے آئے ہو؟ جواباً اگر ملاقاتی کی زبان پر''مالکن جی'' آ گیا تو وہ اگلے لمحے گھر کا مہمان خصوصی بن جاتا ہے! بصورت دیگر سراسیمگی کے شکار ملاقاتی کو مالکن جی کی باتیں، اساطیری کتھائیں، بھجن یا نغمے تب تک سن لینے پڑتے ہیں جب تک وہ مالکن جی کی ہاں میں ہاں ملا کر یہ نہیں مان لیتا ہے کہ میزبان ہی نے مہمان کو پہچان لیا ہے! اور پھر مالکن جی کی سوچ سے ہم آہنگ ہو کر وہ جان گیا ہے کہ میزبان ہی نے مہمان کو پہچان لیا ہے! اور پھر مالکن جی کی سوچ سے ہم آہنگ ہو کر وہ یہ جان گیا ہے کہ وہ غافل تھا جو اپنے پچھلے جنم کے ہم سفر کو پہچان نہیں پایا تھا؟ چاہے کوئی مصلحت کا سہارا لے کر، مالکن جی کو اپنائیت کا احساس دلا کر ایک بار یہ کہہ کر کہ وہ ان کے لئے وہ گھر آیا بھگوان ہے اُن کا مہمانانِ خصوصی بن جاتا ہے!

روز ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن آج کا دن مختلف ہے! مالکن جی کے لئے بھی اور مالتی کے لئے بھی! کیوں کہ پچھلے پانچ برسوں میں یہ دن نرالا ہے!!

مالکن جی مالتی کے شوہر مادھو کی دادی ہے! اور وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ مادھو ایک سرکاری افسر اعلیٰ ہے جس کے گھر، تبادلوں کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں! ہر نئے شہر میں، نے لوگوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کو اور اس کی بیوی کو میل جول بڑھانے کی خاطر کبھی کسی کا مہمان اور کبھی مہمانوں کا میزبان بن جانا پڑتا ہے!

ایک نئے شہر میں، آج، مالتی نے ایک جان پہچان کی اور کچھ اجنبی عورتوں کو اپنے گھر میں مدعو کیا ہے! اور اُس نے اماں جی عرف مالکن جی کی عاداتِ میز بانی سے اپنے مہمانوں کو دور رکھنے کی خاطر، پہلی بار اپنے شوہر کی مدد لی ہے! وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکی ہے! کیوں کہ اُس کی اماں جی رخت مالکن اوڑھ کر، دروازے پر نہ کسی مہمان کا استقبال کر چکی ہے اور نہ کسی کو بھگوان کا درجہ دے کر اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوئی ہے کیوں کہ آج وہ اپنے پراسرار حرکتوں کا سہارا لے کر مالتی کے مہمانوں کی بزم میں زبردستی یا ڈرامائی انداز میں، شامل نہیں ہوئی ہے!!

مالتی آج بے حد خوش ہے کیوں کہ وہ کئی بار اپنے خدشات یعنی اماں جی کے بزم میں آجانے کے امکانات کو رد کر چکی ہے! وہ اس لئے کہ کئی بار، کسی نہ کسی بہانے کی ڈور پکڑ کر، دبے پاؤں چل کر، نوکروں کو اشاروں میں ہدایات دے کر، جب بھی اماں جی کے کمرے کے باہر کھڑی رہی ہے، تب نہ اماں جی کے گنگنانے یا بڑبڑانے کی آوازیں نہیں سن چکی ہے! بلکہ ہر بار پردے کا کونہ پکڑ کر جب بھی اُس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہے تب اماں جی کو مالکن جی کے رنگ وروپ میں نہیں دیکھا ہے! جبھی تو وہ بلا خوف یا خطر اپنی بزم کی میزبانی کرنے کی خاطر، مطمئن ہو کر لوٹ کر آتی رہی ہے! مگر ہاں ہر بار اماں جی کی غیر متوقع خاموشی کو متاثر کن کم اور معنی خیز زیادہ سمجھ کر تذبذب اور تجسس کے دباؤ اور کھنچاؤ سے قدرے پریشان بھی ہوتی رہی ہے! خاص طور پر اب جب مہمان، سماجی ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیالات واحساسات کے بعد موسیقی میں دلچسپی لینے لگے ہیں! وہ سازوں اور آوازوں کی دلکش گونج سے خوفزدہ ہو چکی ہے! وجہ یہ کہ اماں جی عرف مالکن جی میں بے شمار خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی جو چند خوبیاں ہیں اُن میں اس کی موسیقی اور رقص میں دلچسپی بھی ہے! وہ بہت ہی سریلا گاتی ہے اور گاتے ہوئے وہ یوں ناچتی رہتی ہے گویا ایک تتلی پھدک کر، پھولوں کو چوم چوم کر، جھوم جھوم کر، رقص کرتے ہوئے گا رہی ہو! جب اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب ذی ہوش لوگ اکثر اس کی اعلیٰ مہمان نوازی کے باوجود فرار ہونے کے راستے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مہمانوں کا یہ رویہ میزبان مالکن جی کو قطعاً پسند نہیں ہے! نتیجتاً وہ بھاگ رہے مہمان یا مہمانوں کے پیچھے یوں

پڑجاتی ہے گویا ایک زخمی شیرنی زخم دینے والوں کے پیچھے پڑ جاتی ہے! یا ایک محسن جفا کرنے والوں کو اپنی وفا کا احساس دلانے کی خاطر ایک جنگ لڑ رہی ہو! ایک ایسی جنگ جس میں وہ غیر متوقع ہتھیاروں کا استعمال کرتی رہتی ہے اور تب تک جنگ جاری رکھ دیتی ہے جب تک وہ اپنی فتح کا اعلان نہیں کر پاتی ہے! ایسی صورت حال سے خوفزدہ ہوکر، مالتی اماں جی کے عمل اور ردعمل سے گھبرا کر، ایک بار پھر بزم سے کھسک کر اماں جی کے کمرے میں جانا چاہتی ہے تا کہ موسیقی کی گونج سن کر اپنا ارادہ بدل کر، بزم میں شامل ہونے کی خاطر ،فتوحات کی عادی، ایک سپہ سالار کو روکا جائے یہ سوچکر کہ وہ بھی مادھو کی طرح احتراماً نہ سہی، سختی سے اماں جی کو روک کر، اپنے مہمانوں کوانوکھے عذاب سے بچا سکے! لیکن اُس کی بزم میں شامل اس کی واحد جان پہچان والی مہمان ڈاکٹر سرسوتی اُس کی کیفیت بھانپ چکی ہے! وہ کئی بار مالکن جی کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی کر چکی ہے اور جواباً ہر بار وہ اس کو بتا چکی ہے کہ اُس کی دادی اماں جی اپنے کمرے میں رامائن پڑھ رہی ہے اور وہ اس کی بزم میں شامل ہونا نہیں چاہتی ہے! مالتی جھوٹ بول کر، بزم کو مالکن جی کی انہونی یلغار سے بچا تو گئی تھی مگر حالات نے اچانک ایک کروٹ لی تھی! جب سرسوتی کے گانا گانے کی باری آئی تو اُس نے اپنی واحد ملاقات کے دوران جو نغمہ مالکن جی کے اصرار پر، اُس کی ہی سریلی آواز میں سن چکی تھی وہ گا کر سامعین کی اس قدر داد طلب کرلی ہے کہ سبھی مہمان اشتیاق سے اُس کے سر میں سر ملا کر گانے لگی ہیں!

تتلی اُڑی اُڑ کر چلی، پھول نے کہا آ جا میرے پاس،
تتلی کہ میں چلی آکاش!

گانے کی جوش وخروش محسوس کرتے ہوئے مالتی کی سوچ وسمجھ پر خدشات کا بوجھ بھاری ہوتا رہا تبھی اُس نے بزم سے کھسک جانے کی کوشش کی ہے!

چوں کہ ڈاکٹر سرسوتی کی نگاہیں مالتی پر ہی جمی ہیں اس لئے اُس نے اپنی میزبان کی دادی کا ذکر چھیڑ کر جونہی اُس کو بزم میں شامل ہونے کی بات کی ہے، تمام مہمانوں نے مالکن جی کو فوری طور پر، بزم میں شامل ہونے کی مانگ کی ہے۔ یہ مانگ مالتی کے لئے گویا ایک اعلانِ جنگ تھی!

اس لئے مالتی ٹال مٹول کرتے ہوئے جونہی کمرے سے نکل پڑی تو ڈاکٹر سرسوتی اُس

کے ساتھ گویا چیک کر، مالکن جی سے ملنے کی ضد پکڑ بیٹھی ہے۔

بزم کی پر جوش آواز مالتی کے لئے وجہ خوف ہے اس لئے اپنی اماں جی کے بارے میں وہ سرسوتی کو اپنے ٹال مٹول کی وجہ بتانا چاہتی ہے لیکن یہ سمجھ نہیں پا رہی ہے کہ وہ اپنی دادی اماں جی یا مالکن جی کو کس نام سے متعارف کرائے تاکہ مہمان اپنے میزبان کو فوراً پہچان سکے مگر لغت میں تو کیا قاموس میں بھی اس کے کردار سے مطابقت رکھنے والا لفظ مل نہیں سکتا ہے اس لئے مجبوراً اس کو کوشی سے بن چکی مالکن جی کے زندگی کے سفر کی انوکھی کہانی سنانی پڑی!

اماں جی کا اصلی نام کوشلیا ہے اور بچپن میں پیار سے بھی اس کو کوشی کے نام سے یاد کرتے تھے! ایک دولت مند تازہ و سوکھے پھلوں کے بہت بڑی تاجر کی بیٹی کوشی پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنے ارد گرد لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھی! گھر میں چھوٹے بڑے تاجروں کا آنا جانا، سال بھر لگا رہتا تھا، اعلیٰ میزبانی اور مہمان نوازی کے چرچے اس گھر سے جڑے رہتے تھے! جوان کوشلیا اجنبیوں کو بھی اپنائیت کے احساسات دلا کر یہ سمجھایا کرتی تھی کہ میں یا تو آپ کا پچھلے جنموں میں لیا گیا قرصہ اتار رہی ہوں یا پھر اگلے جنم میں قرضہ چکانے کے لئے آپ کی خدمت کر رہی ہوں! ہر شب کو گھر میں بھاگوت کی کتھائیں اور دوسرے مذہبوں سے جڑی حکایتیں سنائی جاتی تھیں! یعنی گھر میں ایک سکون بخش ماحول رہا کرتا تھا! دروازے پر دستک دینے والے یگانے اور بیگانے دونوں ہی گھر کے مہمان ہوا کرتے تھے، اعلیٰ مہمان نوازی کے لئے گھر میں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ضروریاتِ زندگی کی ہر شے کثرت میں دستیاب ہوا کرتی تھیں! ایک ایسے ماحول میں آٹھ سال کی عمر سے ہی کوشی پہلے پہل، اپنے پڑوس میں رہنے والے بچوں اور اسکول میں اپنی سہیلیوں کی ایک تحائف دینے والی ایک چمتکاری لڑکی بن گئی تھی! وجہ یہ کہ کوشی سب کو بلا وجہ اور مانگے بغیر، تازہ اور سوکھے پھلے دیا کرتی تھی! دیکھا دیکھی میں بڑوں نے بھی اُس کو ایک کرشماتی لڑکی کا لقب دے کر اس سے تحائف لینے کی عادات پال رکھی تھیں! رفتہ رفتہ اُس کے اِرد گرد رہنے والوں نے اس کو زمین پر اُتری، سورگ لوک سے تعلق رکھنے والی دیوی بنا کر خوشنودگی حاصل کر کے، اس سے اپنی من چاہی مانگیں بھی پوری کرنی شروع کی تھیں! پھر وہ وقت بھی آ گیا تھا جب ایک بقول

دھارمک ہندوؤں کی کتھا کتاب سے متاثر ہو کر اس نے اپنا نام ساوتری رکھا تھا اور ستوان ساوتری کی کتھا سنا کر، کوشلیا کو ساوتری کا پنر جنم بتانے والے نے اپنی بیٹی کی شادی کا تمام خرچہ وصول کیا تھا! تب کوشلیا نے یہ سوچ کر کہ وہ بھی ساوتری کی طرح ملک الموت سے اپنے شوہر کو بچا سکتی ہے اس لئے اُس نے یہی نام اپنا لیا تھا! اور ارد گرد مطلبی لوگوں نے ایک تصوراتی دنیا میں رہنے والی جوان لڑکی کے جنون کو کرشمات کا عنوان دیا تھا!

ساوتری کی شادی ایک بہت ہی امیر جنگلات کے ٹھیکیدار کے ساتھ ہوئی تو وہ گھر کی مالکن بن گئی تھی، گویا اس کو کم عمر میں ہی حکمرانی مل گئی تھی! گھر میں بہت سارے مہمانوں کا آنا جانا تھا اور وہ ایک ایسی میزبان بن گئی تھی جو ''مالکن جی'' سن کر مہمان کو بھگوان سمجھ کر خدمت کرتی رہتی تھی۔

قصیدے بازوں نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایک گھر کو ''مالکن جی کا آشرم'' بنا دیا تھا! گویا ایک ایسا چشمہ وجود میں آیا تھا جس کے میٹھے پانی کی لذت حاصل کرنے کے لئے رشتے دار، ناطے دار بلکہ اجنبی بھی ارد گرد رہا کرتے تھے! اور چوں کہ پانی پی لینے کا موقع فقط اُن کو مل جایا کرتا تھا جو آشرم کے دروازے پر ''مالکن جی مالکن جی'' کہہ دیا کرتے تھے اور مالکن جی خود ہی مہمان کو آزمائش کے لئے آئے بھگوان مان کر اس کی آؤ بھگت کیا کرتی تھی! گویا ''کھل جا سم سم'' کہہ کر ہر غرض مند اور خود غرض مہمان ایک ہیرے جواہرات کی غار میں گھس جایا کرتا تھا!

بے غرض لوگ بھی جب دروازے پر دستک دیا کرتے تھے تب اُن کو یہ جانکاری دیکھ کر یا سن کر مل جایا کرتی تھی کہ پتھروں کی مورتیوں کے سامنے منتروں کا جاپ کرنے سے اچھا ہے کہ وہ مالکن جی کے آگے پیچھے رہیں، ان کے لمبے بھاشن سنیں۔ گئی رات تک ان کے گائے بھجن سن لیں، پرانی فلموں کے نغمے سن لیں، ان کی کتھائیں سنیں یا پھر مالکن جی کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لئے اپنے قصیدوں کی طاقت سے اپنی خواہشیں مرادیں پوری ہونے دیں! اور یوں مالکن جی کا گھر مہمانوں کے لئے ''جنت'' کے تصور جیسا تھا! مفت کھانا، مفت رہائشی کمروں میں رہنے والوں کو ان کی زبان پر فرمائش آتے ہی پوری ہو جانے کے بعد کبھی کبھی یہ غلط فہمی ہو جایا

کرتی تھی کہ وہ سچ مچ ہی بھگوان کے روپ ہیں! ورنہ ایسے کرشمات کیوں ہوتے رہتے!؟ چند شاطر لوگوں نے مالکن جی عرف میزبان جی کی لمبی اوب جانے والی تقریروں سے بچنے کی خاطر ان کی ہی کہی باتوں کو قصیدہ گری کی چاشنی لگا کر، ان کو سنانا ایک معمول بنا لیا تھا! گویا آشرم میں رہنے کی شرائط کو اپنے رنگوں سے رنگ ڈالا تھا! اُن میں مالکن جی کے دل کی عمیق گہرائیوں کو چھو لینے والے طریقے جو آسان، آزمودہ اور نہایت کامیاب بھی ثابت ہوتے رہتے تھے! یعنی بہت ہی ہونہار طالب علموں کی طرح عمل کرتے ہوئے امتحانات میں پوچھے گئے تمام سوالات کے جوابات دے کر یہ گزارش کرنا کہ کوئی بھی سوال اگر غلط ہو تو صحیح جوابات کو رد کر دیں اور یوں وہ سب کہہ دینا جو مالکن جی اپنے مہمانوں کے حوالوں سے بتا دینا چاہتی ہے! گویا اس کے لبوں سے مچل رہے جملوں کو چرا کر بول پڑنا رنگ برنگی ثمر آفرین قصیدے بن کر مقبول ہو رہے تھے! مثلاً مالکن جی کے سامنے کھڑے ہو کر یہ کہنا...... مالکن جی!! تو کیا آپ نے مجھے اپنی پہلی نظر میں پہچان لیا! میں کیا اپنے پچھلے جنم میں بھی ایسا تھا......؟؟ اب یہ آپ کو ہی بتانا پڑے گا کہ میں نے آپ کا پچھلے جنم میں لیا قرضہ چکانے کے لئے یہ جنم لیا ہے؟ یا پھر آپ سے اس جنم میں لیا قرضہ، اپنے اگلے جنم میں اتارنے جا رہا ہوں؟ اگر ایسا ہو تو میں خوشی خوشی آپ کے کرم کا بوجھ لے کر مر جانا چاہتا ہوں! آپ کی قسم دیوی ماں!! آپ درگا ہیں یا ماتا ویشنو دیوی؟ مالکن جی! میں مستقل طور پر آپ کے آشرم میں رہنا چاہتا ہوں! ایک کرشماتی میزبان کا مہمان بن کر! آپ مجھے بھگوان سمجھیں یا ایک انسان، میرے لئے آپ مہمان ہیں!

مالکن جی؟ سنی سنائی بات ہوتی تو میں ہرگز یقین نہیں کرتا؟ مگر آپ کے آس پاس رہ کر خود سن کر اور دیکھ کر یہ جان گیا ہوں کہ آپ چرندوں، پرندوں بلکہ رینگنے والے جانداروں سے ہم کلام ہوتی ہیں! واہ واہ!! کیا بات ہے! میں خوش ہوں کہ آپ کے کرشمات خود ہی ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں! آپ دیوی دیوتاؤں کے وجود سے منکر ہونے والوں کا وجود مٹانے دینے کے لئے جنم لے چکی ہیں! میری ساری زندگی آپ کے قرب میں گزر جائے! بس یہی ایک ارمان ہے!!

مالکن جی! آج کل امیر ترین لوگوں کے گھروں میں راشن کے اسٹور نہیں ہوتے ہیں

جبکہ آپ نے حویلی کے ایک حصے میں آٹا، چاول، گھی، تیل یعنی کھانے پینے کی تمام چیزیں یوں لگ رہی ہیں گویا نمک کا ایک پہاڑ! نکالتے جاؤ، اور نکال کر دیکھو تو لگ رہا ہے کچھ نکالا ہی نہیں! لگتا ہے یہ کرشمہ بھی آپ کی ہی بدولت عمل میں آجاتا ہے! واہ! واہ!!

مالکن جی! آپ کی منصوبہ بندی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے! مہمانوں کے لئے رکھے گئے ہر کمرے میں ایک ٹی وی! جو مرضی وہ دیکھ سکتے ہیں آپ کے مہمان! ورنہ وہ گھروں میں بھی اپنی پسند کے پروگرام دیکھ نہیں پاتے! آج ٹی وی پر ایک طویل عرصے کے بعد ایک انگریزی فلم دیکھ لی ورنہ گھر میں کارٹون دیکھنے پڑتے ہیں یا پھر خبریں! واہ! واہ!! کیا بات ہے مالکن جی!!

مالکن جی! وہ کتھا میں بار بار سننا چاہتا ہوں جس میں میزبان راجہ ایک مہمان کو خوش کرنے کے لئے اپنا راج پاٹھ اور اپنا جسم بھی مہمان کو سونپ دیتا ہے! آپ بھی ویسی ہی میزبان ہیں ورنہ ایک ٹھٹھر رہے مہمان کے جسم پر آپ اپنا پشمینے کا شال کیوں ڈال دیتے!

مالکن جی! کسی نے کہا کہ آپ کا یک ہی بیٹا ہے! راجہ دشرتھ کی بیوی کوشلیا کی طرح! کہیں آپ نے رام کو جنم دینے کے لئے ہی یہ جنم تو نہیں لیا ہے؟ مالکن جی؟ مالکن جی! میں آپ کی خاموشی میں آپ کا جواب سن چکا ہوں! آپ کی قربت میں بیٹھ کر یہی تو سیکھ چکا ہوں!

جب تک اماں جی عرف مالکن جی اپنے گھر میں رہتی تھی تب تک ان کے مہمانوں کی گنتی کبھی کم نہیں ہوتی تھی! گھر بھرا بھرا رہا کرتا تھا۔ ایک بار جو آتا تھا وہ بار بار آیا جایا کرتا تھا! ظاہر ہے کہ ان دنوں وہ بہت خوش رہا کرتی تھی! مطلب پرست پڑوسی، نزدیکی یا دور کے رشتے دار، اکثر ان کی صبح اور شام کی آرتی میں شامل ہو کر، ناشتے اور شام کے کھانے کو یقینی بنایا کرتے تھے! اخبار والے، دودھ والے، دھوبی، ڈاکیہ مالکن جی کی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف تھے اس لئے مصلحتوں کا سہارا لے کر اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے! ورنہ کسی کو کیا مل جاتا اگر وہ مالکن جی کو بتا دیتا کہ کتا اُن کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر بھاگ گیا تھا نہ کہ یہ سن کر کہ اگر وہ بھاگ نہیں جاتا تو مالکن جی پٹائی کر دیں گی! پرندہ آواز سن کر اُڑ جاتا ہے، نہ کہ کوئی پیارا یا ڈراونا جملہ سن کر! ایک آوارہ مویشی کو اگر پھاٹک کے باہر کچھ کھانے کو مل جائے تو وہ مالکن جی کو زبان سمجھے بغیر بھی، آنگن میں ہرگز گھس نہیں جاتا!

اماں جی عرف مالکن جی کے شوہر کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے نے آشرم کو رفتہ رفتہ ایک گھر میں بدلنے کی کوشش تھی! امریکہ میں مقیم بیٹا ڈالر بھیجتا رہا مگر مہمانوں پر آنے والے ضروری اخراجات کے پھیلاؤ کے بارے میں اماں جی کی بے فکری آشرم کے زوال کا سبب بن گئے تھے! مہمانوں کی تعداد، ماضی کی طرح بے قابو ہوتی مگر جب ان کے پوتے ناد نے گھر میں ہر چیز ناپ تول کر ہی لانے کی پابندی لگادی تو آشرم کے رنگ خود ہی پھیکے پڑ گئے! اور پھر آشرم ایک گھر بن گیا! بدل رہے حالات میں مہمان نہ مالکن کے استقبال کے لئے دروازے پر نظر آتے رہے اور نہ بھگوان بن کر مالکن جی کو مدد کے لئے صدائیں دیتے رہے! گویا مالکن جی کو مہمان نوازی کے موثر موقع نہیں ملتے رہتے! اور اب نہ وہ کتھائیں سنا سکتی ہے اور نہ بھجن یا نغمے گا سکتی ہے اس لئے بے قراری، تذبذب اور تجسس ذہنی تناؤ کی وجہ بن گئی ہے! تب سے اب تک خاص طور پر تب سے جب سے وہ اپنے پوتے کے ساتھ نئے شہروں میں رہنے لگی ہے! اپنے اردگرد اجنبیت کا ماحول دیکھ کر وہ اکثر بوکھلاہٹ کی شکار ہوتی رہتی ہے! وجہ یہ کہ نہ تو کوئی اس کو مالکن جی ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور نہ کسی بھی چہرے میں وہ اپنے بھگوان کا عکس دیکھ سکتی ہے! اس پر یہ طرہ کہ اس کی عجیب حرکتوں کو دیکھ کر اس پر ہنسنے والوں یا سنجیدگی سے گھورنے والوں کو وہ اپنی کالی زبان دکھا کر ڈراتی رہتی ہے! وہ اس لئے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی کو بھی شراپ دے سکتی ہے! بلکہ غصے میں آکر کسی کو اپنی نگاہوں کی غیبی قوت سے پتھر بنا سکتی ہے!؟ یا ایک پرندہ!!

اماں جی عرف مالکن جی کی ایسی حرکتوں سے خوفزدہ ہو کر، ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی بیوی، مالتی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے کہ اماں جی کا نہ کسی سے تعارف کرایا جائے اور نہ گھر آئے کسی بھی خاص یا عام شخص سے اس کو ملنے دیا جائے! مگر پھر بھی اماں جی ایک پانی کی لکیر کی طرح کہاں سے، اور کب کمرے میں داخل ہو جاتی ہے یہ مالتی اکثر جان نہیں پاتی ہے! اور کبھی کبھی وہ ڈراؤنی صورتحال کی شکار بھی ہو جاتی ہے! مثلاً ایک بار ان کے ڈرائنگ روم میں ایک معزز مہمان سو رہا تھا! اماں جی اپنی پوجا کے بعد پرشاد گھر والوں کو دے کر بے حد خوش ہو رہی تھی! اور سو رہے مہمان کے ہونٹوں پر پرشاد رکھ کر چلی گئی تھی! مہمان کو چھینک آ گئی تھی جس کی وجہ سے

لبوں پر رکھا پرشاد گلے میں اٹک گیا تھا اور اگر الٹی نہ آجاتی تو شاید مہمان کی سانس اٹک جاتی!

ایک نئے شہر میں مالتی کے گھر میں، پہلی پارٹی ہورہی ہے! چار گھنٹوں سے چل رہی، رعنائیوں سے منور بزم میں شامل ہونا مالتی کے لئے بزم میں ایک ٹائم بم لانے جیسا ہے! اس لئے وہ اماں جی کو بزم سے دور رکھنے میں وہ خوشی جو اس کو مادھو نے دی ہے، اُس کو وہ ایک صدمے میں بدلنا نہیں چاہتی ہے اس لئے سرسوتی کو اپنی اماں جی کے بارے میں مکمل معلومات دے کر اور اپنے خدشات کو بیان کر کے مالتی کو یقین ہے کہ وہ اپنی فرمائش واپس لے گی اور دونوں کوئی بہانہ بنا کر بزم میں مالکن جی کے بغیر ہی شامل ہو جائیں گے تا کہ دھما کہ خیز مواد کو ٹال کر تقریب کو انجام تک پہنچایا جا سکے!

مگر سرسوتی نے اس کو چونکا دیا ہے! وہ اماں جی عرف مالکن جی سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہے! وہ مالتی کا ہاتھ پکڑ کر، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، مالکن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے!

ڈاکٹر سرسوتی علم نفسیات کی ماہر ہے! آج وہ مالکن جی سے دوسری بار ملنے کی خواہشمند ہے! وہ اس لئے کہ اپنی پہلی ملاقات کے دوران جو شکوک اُبھر کر آئے تھے، وہ مالکن جی کی زندگی کی کہانی سُن کر یقین میں بدل گئے ہیں! جبکہ مالتی اپنے خدشات کا بوجھ لے کر اپنا ماں جی سے ملنا ہی نہیں چاہتی ہے!

اماں جی عرف مالکن جی کے کمرے کے باہر دونوں ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ کمرے کے اندر داخل ہونا چاہئے یا نہیں! ہاں مالتی آج اماں جی کے تیور دیکھ کر حیران بھی ہے اور پریشان بھی ہے! یہ سوچ کر کہ عام طور پر ذرا سی آہٹ سن کر دروازے پر آجنے والی مالکن جی آج اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے کیوں نہیں آئی ہے؟ بلکہ آج وہ کمرے میں نہ چکر لگا رہی ہے اور نہ معمول کی طرح اپنی بے قراری پر قابو پانے کی خاطر گنگنا رہی ہے؟ کیوں؟ بلکہ گھر میں گونج رہے نغموں اور موسیقی کی آواز سن کر وہ آج جھوم جھوم کر اپنے گانے والی مہمانوں سے ملنے بھی نہیں آئی ہے! کیا وہ اپنی خفگی کا اظہار کر رہی ہے یا اپنے غصے کا، اپنے ہی طریقے سے مظاہرہ کر رہی ہے؟

ظاہر ہے کہ مالتی کو احساس جرم ہے اس لئے وہ پارٹی کے اختتام سے پہلے اماں جی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی ہے! وہ اس لئے کہ آج پہلی بار مادھو نے، مالتی کے اصرار پر، نہایت ترش زبان میں، اپنی دادی کو بتا دیا ہے کہ ان کے گھر آیا ہر ملاقاتی اس کا مہمان نہیں ہوتا ہے! اور جو مہمان ہوتا ہے وہ بھگوان نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک اچھا یا برا انسان ہوتا ہے! وہ اگر کسی خاص مقصد سے، کسی ایک سے یا سب سے ملنے آتا ہے اور مل کر چلا جاتا ہے! اور پھر آخر میں یہ کہہ دیا تھا کہ آج مالتی کے مہمان آرہے ہیں اس لئے دادی کو اپنے کمرے میں تب تک رہنے کی ہدایات دی تھیں جب تک مہمان اپنے گھر سے چلے نہیں جاتے ہیں! گویا مادھو نے سچ بول کر اپنی دادی سے وفا کی تھی!

مالتی کے سامنے وہ منظر بار بار آرہا ہے جب اپنے پوتے کی گرجدار آواز سن کر اماں جی پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی جیسی ایک فاتح کو اچانک شکست دے کر جنگی قیدی بن جانے کے وقت اُس پر طاری ہو جاتی ہے!

تب دادی کچھ بھی نہیں بولی تھی! گویا حکم کی تعمیل کر چکی تھی! چار گھنٹوں کے دوران جب بھی مالتی، اماں جی کو دیکھنے آیا کرتی تھی وہ دبے پاؤں چل کر آیا کرتی تھی تاکہ اماں جی کو تاک جھانک کے بارے میں افشانہ ہو! لیکن اس بار وہ سب جان کر جانے کیا رویہ اختیار کر لے یہ سنجیدگی سے سوچ رہی ہے! خاص طور پر تب جب دادی یہ جان جائے گی کہ جن مہمانوں سے اُن کو دور رکھا گیا تھا انہوں نے ہی ان کو اپنی بزم میں شامل ہونے کے لئے مدعو کیا ہے! ظاہر ہے کہ مالکن جی اگر بزم میں شامل ہوئی تو اس واقعے کو کسی اسطیاری کتھا سے جوڑ کر بزم کا رنگ بدل دے گی اور اپنے رنگ میں نظر آئے گی! بلکہ یہ بھی بتا سکتی ہے کہ اس کو گھر کی مالکن ہونے کے باوجود مہمانوں سے دور رکھا گیا ہے اور یہ بھی تباہ کن کروٹ ثابت ہوسکتی ہے!؟ بحث اور مباحثوں کے بعد دونوں کمرے میں داخل ہو کر حیرت زدہ ہوگئے ہیں! اماں جی عرف مالکن جی ایک کونے میں یوں نظر آرہی ہے گویا کوکھ میں بیٹھا ایک بچہ! یہ سوچ کر کہ ایک شکست خوردہ فاتح جنگی قیدی بن کر، خون کے آنسو بہاتا رہتا ہے، مگر جب کوئی، اپنا یا غیر، اُس کی دلیری کا ذکر چھیڑتا ہے تب اس کے شکستہ دل کو قرار آجاتا ہے! بس یہی سوچ کر سرسوتی مالکن سے مخاطب ہے جب کہ مالتی خاموش ہے اور صورت حال کا جائزہ لے رہی ہے۔

مالکن جی! ہم آپ کی پسندیدہ گانا گا رہے ہیں! سن رہی ہیں نا آپ؟ میں آپ کو مدعو کرنے آئی ہوں، نہیں نہیں! آپ میزبان اور ہم سب مہمان، چلیے بزم کی میزبانی سنبھالئے! چلیے نا!!

اماں جی عرف مالکن جی کی پر اسرار خاموشی دیکھ کر سرسوتی گھبرا کر بڑبڑا رہی ہے! مالکن جی پر نظریں جما کر وہ مالتی کو سمجھا رہی ہے!

مالکن جی بیمار ہے! اسّی برس کی یہ عورت آٹھ سال کی عمر سے ہی بیمار ہے! کوشی، کوشلیا، درگا، شارکا، مریم اور ساوتری کا علاج اس کے والدین کر چکے ہیں پھر مالکن جی کا علاج اُس کا شوہر اور بیٹا کر چکے ہیں! ہر بیماری کی طرح اس بیماری کی شدت صحیح علاج سے کم ہو جاتی ہے! بلکہ مریض کو شفا بھی نصیب ہو جاتی ہے! مگر غلط علاج بیمار کو ہی کھا جاتا ہے!

وفا کرنے والوں نے مصلحتاً جھوٹ بول کر کوشی کو ساوتری مان کر، اس کے تصور کو حقیقت کے رنگوں میں قبول کر کے، مالکن جی کو ایک میزبان بنا دیا اور مہمانوں کو بھگوان! اور وہ سب جھوٹ بول کر، وفا سے صحیح علاج کرتے رہے! بیماری کی شدت کم ہوتی رہی اور بیمار کرقرار آتا رہا! جبکہ مادھو نے سچ بول کر مالکن جی کے ساتھ بے وفائی کی ہے اور جفا غلط علاج ثابت ہوسکتا ہے! یہ اگر اپنی دادی سے بے حد پیار کرنے والے پوتے نے سوچا ہوتا تو آج کا دن اماں جی عرف مالکن جی کے لئے ایک ''نیا دن'' ثابت نہ ہوا ہوتا! اگر آج بھی، معمول کی طرح، مادھو مصلحتاً خاموش رہتا تو شاید ایک مہمان اپنی میزبان کو ایک روز کا جھٹکا نہیں دیتا! یہ سوچ کر مالتی لرز گئی ہے!

اپنی اماں جی کی خاموشی توڑنے کی خاطر مالتی نے اس کے کندھے کو یوں چھو لیا ہے گویا ایک تتلی کے رنگدار پروں کو چھو کر اُس کو اُڑنے کے لئے اکسا رہی ہو! مگر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ!

تتلی بے جان تھی اس لئے اُڑ کیسے پاتی؟ مالتی چیخ پڑی ہے! مہمان گا رہے ہیں اور سارے گھر میں ایک کورس نغمے کی گونج نے مہمانوں تک اس کی درد بھری آواز پہنچنے نہیں دی ہے۔

سرسوتی مالتی کو سمجھا چکی ہے کہ کوشی یا مالکن خود ایک مہمان تھی! گلشن میں آئی ایک تتلی کی طرح اور وہ اُڑ کر چلی گئی ہے!!

☆☆

ناصح

ناصح ۔یعنی نصیحت کرنے والا۔!

جو نہ انسان اور نہ بھگوان ہے کہ بلکہ دونوں کی رضامندی سے انسان کی ایک کرشماتی ایجاد ہے! ایک ایسی ایجاد جو ایٹم بم کی طرح تباہ کن بھی ہو سکتی ہے اور ثمر آفریں بھی۔

ناصح، کیونکہ ایک ایسی ایجاد ہے جو اکثر مددگار ثابت ہوتی آئی ہے اس لئے اس لئے کمپیوٹر کہلاتی ہے۔ مگر ناصح وہ کمپیوٹر 'جی' نہیں ہے جو سوالات پوچھ کر صحیح جواب کے لئے نقد انعامات دیتی رہتی ہے! جیسے آج کل ایک بے حد مقبول ٹی وی کھیل ''کون بنے گا کروڑ پتی'' میں ہوتا رہتا ہے ویسے ہی ناصح وہ کمپیوٹر ہے جس سے سوالات کر کے جواب یا جوابات سن کر آپ کو اپنی الجھی ہوئی زندگی کو سلجھانے میں ثمر آفریں نتائج مل سکتے ہیں۔!

جی ہاں! اور ناصح سے رجوع کرنا بھی بہت آسان ہے! کوئی بھی خود آکر ''کمپیوٹر'' جس کو آپ لوگوں نے اپنی مقبولیت کی وجہ سے کمپیوٹر مہاراج یعنی کے ایم (KM) کا لقب دیا ہے، آمنے سامنے بیٹھ کر اپنی مشکل یا مشکلات بیان کر کے معقول نصیحت یا مشورہ لے سکتا یا سکتی ہے!

کوئی ای میل، ایس ایم ایس (S.M.S) یا فون کرنے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی ہے اُن کو جن کو آپسی رازداری پر بھروسہ ہو، براہ راست رجوع کر سکتے ہیں!۔

شکوک کو، ابھرنے سے پہلے، نیست و نابود کرنے کی خاطر، ایک حلف نامہ کمپیوٹر مہاراج میں درج کرنے کے بعد، نصیحت حاصل کرنے والے کو ایک موٹی رقم جمع کرنی پڑتی

ہے، رقم کتنی ہوگی یا ہے یہ راز کے گہرے تہہ خانے میں بند رہتی ہے بلکہ انکم ٹیکس والوں کی باز جیسی نگاہوں سے بھی چھپی رہتی ہے۔ شرطیہ!

کے ایم کی بس اتنی کہانی ہے۔ کون آئے گا اور کون چلا گیا ہے یہ کسی اور کو بلکہ سراغ لگانے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا ہو سکتا ہے! گویا نہ انکم ٹیکس کا چکر اور آمدنی کے ذریعے کے بارے میں پوچھ تاچھ...! دعویٰ شرطیہ اور قابل یقین ہے۔ کارروائی کے مرحلے بھی اتنے آسان ہیں کہ ایک ان پڑھ بھی ''کے ایم'' کے سامنے نڈر ہو کر اپنی راز کی باتیں بھی خوف و خطر خدشات کے بغیر کہہ سکتا ہے......! وضاحت کی ضرورت نہیں......! جواز یا وکلات کی مدد درکار نہیں...... جی ہاں۔ آزما کر خود ہی دعویٰ کو حقیقت کے رنگوں میں پا لیجئے۔ صاحبان! قدردان!!

کارروائی کا آغاز نصیحت کا طلب گار اپنی زندگی کا خاکہ لکھ کر، بول کر یا کسی سے لکھوا کر ''کے ایم'' حوالہ کر سکتا ہے جس پر فوری کارروائی ہوتی ہے......

پھر ''کے ایم'' جائزہ لے کر اگر کہہ دے یا لکھ دے ''کے ایم قبول کرتا ہے'' تو کارروائی جاری رہے گی۔ بصورت دیگر جمع کی ہوئی رقم کا پچاس فیصدی حصہ لوٹا دیا جاتا ہے اور حلف نامے کے تحت کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی ہے......! ہاں للکارنے والے خود ہی اپنے گلے کا ناپ قانون کے رکھوالوں کو دیں گے......! جی ہاں!!

کارروائی کے دوران اگر کوئی ''بے ہودہ سوال'' پوچھا گیا اور ''کے ایم'' نے اپنے غصے کا تاثر دیا تو جن سوالات کے جوابات درج ہو چکے ہوں وہ بھی طلب گار کو دینے سے پہلے مٹا کر، اس کو فوری طور پر دفع ہو جانے کا حکم سنا کر، جمع کی ہوئی رقم کے بارے میں سوچنے کے لئے بھی منع کیا جاتا ہے...... نرم یا گرم لہجے میں...... کندھے پر ہاتھ رکھ کر، افسوس کے احساسات کے ساتھ یا دھکے مار کر دہشت کے معنی خیز خیالات کے ساتھ......!! اور اگر ''کے ایم'' نے یہ تاثر دیا کہ ''کے ایم خوش ہوا'' تو نصیحت کا طلب گار مقررہ سوالات کی تعداد کے علاوہ، بغیر مزید رقم جمع کیے ایک اور سوال پوچھ سکتا ہے مگر کسی خوش بخت کے سوالات سن کر اگر ''کے ایم بہت خوش ہوا'' کمرے میں گونج اٹھے تو بحث بھی ہو سکتی ہے یا کمپیوٹر کی زبان میں لمبی چیٹ "CHAT" یا گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ وقت کی ٹوک کے بغیر......! کسی بھی پابندی کی روک کے بغیر۔

نندو جو نندن چند سے نند کمار بن گیا ہے، وہ پہلا خوش بخت ہے جس نے بے ہودہ زون سے نکل کر اور قبول ہونے کے بعد، نہایت صاف گوئی سے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بول کر ''کے ایم'' سے بار بار یہ سن لیا ہے ''کے ایم بہت بہت خوش ہوا''

کیونکہ ذہین ہونے کی وجہ سے، اُس نے بے ہودہ سوالات کو اپنے دماغ میں کبھی جگہ دی ہی نہیں تھی تو اب کیوں اپنے ذہن میں وہ ایسے بیچ بو ڈالتا جن کو اس نے کیڑوں مکوڑوں کے سپرد کر دیا تھا۔! مثلاً کسی کو آزمانے کے لئے یہ پوچھا۔ میں ہندو ہوں یا مسلمان؟ میری عمر کیا ہے، بتایئے؟

اندھا من کی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے؟ یا اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر یہ کہ میں امتحان میں پاس ہو جاں گا یا فیل؟۔

کیا آپ آئی اے ایس کے سوالات کا پرچہ مجھے بتا سکتے ہیں؟

ملک کے غریب ایک ہو کر کیا اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں؟

کیا میں چاند پر رہ سکتا ہوں یا ستاروں کا بے تاج بادشاہ بن سکتا ہوں؟

کیا آپ نے بھی غیر ملکی بینکوں میں کھاتے کھولے ہیں؟

کم از کم کوئی راستہ بتا دیجئے کہ۔ کیسے۔؟؟

نند کمار نے اپنے بارے میں یہ کہتا تھا جو'کے ایم'' میں درج ہو چکا ہے وہ یہ ہے......

میں نند سے نندن چند اور اب نند کمار ہوں۔ زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکا ہوں! مجھ میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی ہیں۔ اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ہیں! مجھے یہ خوبرو چہرہ اور چہرے پر انمٹ معصومیت کے تاثرات، مجھ میں میری ماں کی شناخت کرار ہیں۔ میری ماں کی خوبصورت آنکھوں میں بینائی نہیں ہے۔ مگر خوبصورت ہیں!

میری یادداشت کا حصہ بن جاتا۔ گویا ٹیپ ریکارڈ میں ریکارڈ ہوئی آواز ہو......کون سا حصہ کب سنانا پڑے، بٹن دبا کر، بول پڑتا ہوں......

جی ہاں! ماں نے مندروں میں جا کر رامائن سن کر یاد نشین کر لی تھی اور میں نے ماں سے ان کی سنائی گئی اساطیری کتھائیں، حکایتیں اور داستانیں ایک بار سن کر، اپنی یادداشت کے

خزانے بھر دیے ہیں......!

جہاں بھی جاتا ہوں سامعین کو متاثر کرتا ہوں......!

جی ہاں! اپنی ماں کی طرح، میں بھی، گرم بات کو نرم لہجے میں بول کر، لال رنگ کے تپ رہے لوہے کو برف میں ڈال کر کالا بنا دیتا ہوں۔!!اور ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔

جی ہاں! میرا یہ خوبصورت جسم، میرے باپ کی وجاہت کا نمونہ ہے۔ ان کی طرح میں بھی احمق نظر آتا ہوں مگر ہوں ذہین......بہت ذہین۔!......!!

ہاں مگر باپ کی صحبت میں رہ کر، منفی سوچ کو اپنی ذہانت کی زرخیز زمین میں اگاتے اگاتے نند کمار بن گیا ہوں ورنہ نندو ہی ہوتا ہے۔!

لیکن شاد بھی اور ناشاد بھی ہوں!......!!

ہم لوگ ایک پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ راجماش اور مرچیوں کی کاشت کیا کرتے تھے۔ اور بہت خوش رہا کرتے تھے...... میرا باپ، میرے نانا کا نوکر تھا۔ ان کی اکلوتی اندھی بیٹی سے شادی کی تو اپنے گاؤں کے، ان سبکدوش ہو کر، گاؤں لوٹ کر آئے فوجیوں کو دیکھ کر، حسد کی آگ میں جل جانے کی عادت اپنا کر، اپنے خوبصورت جسم سے، فوج میں بھرتی کرنے آئے افسروں کو، متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو غرور کو ہم سفر بنا گئے! تب جب میں پانچ سال کا تھا۔ ایک سال بعد فوج میں نوکری کرنے کے بعد گاؤں لوٹ کر آ گئے۔! سبکدوش ہو کر یا لڑائی کے دوران اپنی ٹانگ کٹوا کر آئے ہوتے تو پنشن پر آئے ہوتے......! مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ تب وہ خواب جس کو دیکھ کر وہ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے یعنی وہ بھی ملٹری کی قمیض یا بنیان پہن کر، روز داڑھی بنا کر، مونچھوں کی تاؤ دے کر، اپنی قمیض کے کاج میں لال دھاگہ ڈال کر، دھاگے کے ساتھ چاقو باندھ کر، چاقو کا ایک جنگی توپ کی طرح مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ملٹری مگ (Mug) دیکھتے رہتے جیسے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک راجا پیدل چل رہے سپاہیوں کو دیکھ رہا ہو۔!۔ وہ خواب پورا ہوا نہیں تھا......! جس کے لئے وہ خود ہی ذمہ دار تھے کیونکہ اُس نے اپنے افسر کا پستول چرا لیا تھا۔ بیچ ڈالنے کی خاطر۔ بھاگتے بھاگتے افسر نے ٹانگ پر گولی چلا کر اسپتال بھیج دیا تھا۔ ٹانگ کاٹنی پڑی تھی اور کورٹ مارشل کے بعد گھر بھیجا گیا

تھا......! اور گاؤں میں جہاں وہ اکثر اپنے یونانی دیوتاؤں کے مانند جسم کی، غرور کی انتہا چھو کر، نمائش کیا کرتا تھا وہاں بیساکھی کے سہارے چل کر اپنے ہی اندر چل رہی انتقام کی آگ سے حسد کے خیالات اُبل اُبل کر، بدکاری کے ارادوں میں بدل گئے تھے! شراب اور شباب سے اپنے شکستہ دل کو بہلانا اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ شراب وہ شہر سے خرید کر لایا کرتا تھا جبکہ میری ماں کا شباب اُس کو سکون پہنچا دیا کرتا تھا......!

شراب کے نشے میں دل کی باتیں زبان پر آجایا کرتی تھیں اور نغموں میں صرف یہ ظاہر ہوا کرتا تھا کہ ایک خوبصورت جسم والے کے کندھوں پر ہی افسروں کے کندھوں پر سجتے ہیں اور جس کرنل کا وہ اردلی تھا وہ اس کی نظر میں ایک وردی میں ایک کاٹھ کا پتلا تھا......

نانا نانی کی موت کے بعد، اُس نے شہر کے تاجروں کو، زمین پر کاشتکاری کا حق فروخت کر ڈالا تھا۔ اور رقوم کو شراب بنا کر پیتا رہتا تھا۔ پھر جب زمین تاجروں نے ہڑپ لی تب وہ خود شراب بنا کر پیتا رہتا تھا......

نانا نانی کی موت کے بعد، اُس نے شہر کے تاجروں کو، زمین پر کاشتکاری کا حق فروخت کر ڈالا تھا۔ اور رقوم کو شراب بنا کر پیتا رہتا تھا۔ پھر جب زمین تاجروں نے ہڑپ لی تب وہ خود شراب بنا کر پیتا رہتا تھا...... یا پھر اپنے جسم کو دیکھ کر اپنے آپ کو فوجی افسر سمجھ کر ہنستا رہتا تھا!

جنگلات کا ایک افسر خراب موسم کی وجہ سے گاؤں کے واحد پکے مکان میں چند روز رہ کر، مہمان نوازی، خاص طور پر لذیذ کھانے کھا کر، اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ میرے باپ کو اپنے سرکاری ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار اور باورچی بنا دیا تھا — افسر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کھانا میری ماں بنایا کرتی تھی۔ گھر میں بھی اور ریسٹ ہاؤس میں بھی — باپ کو یہ غلط فہمی تھی کہ افسر اس کی چال ڈھال پر نثار تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں کبھی کبھار افسران آیا کرتے تھے اس لیے چھوٹے شہر میں جب میرے باپ نے ریسٹ ہاؤس میں چوری چھپے مے کشی کرنے والوں کو دیسی شراب کے ساتھ کھانے کی سہولیات بھی میسر کر دی تھیں تب وہ سلسلے کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوا تھا —! چونکہ

ان کے ساتھ بیٹھ کر پی لیا کرتا تھا اس لیے خوش تھا۔

وہ سائیکل کے ٹیوبوں میں، ناجائز طریقوں سے بنائی گئی مقامی شراب ڈال کر میں لایا کرتا تھا— اور گاہکوں کو بلایا کرتا تھا۔ ماں کو معلوم نہیں تھا جبکہ میں باپ کا فرماں بردار بیٹا تھا۔ باپ کو خوش کرنے کی خاطر اُس کی بدکاری میں شریکِ کار تھا بند بوتلوں میں دیسی شراب ملایا کرتا تھا— شہر سے دور دیسی بھٹیوں سے شراب بھی لایا کرتا تھا۔ ایک بار پکڑا گیا مگر چہرے کی معصومیت اور ماں سے سُن کر رٹے ہوئے منتر بول کر بری ہوگیا تھا۔ مگر اس کے بعد حوصلے بلندیوں کو چھو لینے لگے تھے!

گاہکوں کی گفتگو، جو انگریزی میں ہوا کرتی تھی اور پھر مادری زبان میں ترجمہ کر کے مجھے یا میرے باپ کو سنائی جایا کرتی تھی۔ سُن کر اور لفظ بہ لفظ یاد رکھ کر، جب میں گاہکوں کے علاوہ اسکول میں بھی روانی اور صحیح تلفظ کے ساتھ بولا کرتا تھا تو سننے والے دھنگ ہو جایا کرتے تھے۔ مگر چوں کہ میں امتحانات میں کورا کاغذ استادوں کو دے دیا کرتا تھا تب وہ چوک کر حیران ہوا کرتے تھے۔

بار بار آس پاس کھڑے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جانے کی وجہ سے، میں نے اسکول جانا بند کر دیا تھا— وہ لوگ مجھے کوئی روحانی قوت والا لڑکا سمجھ کر میرے پاں چھو کر مجھے بھاگ جانے کے لیے مجبور کیا کرتے تھے—!!

میرا باپ خوش تھا جبکہ ماں کو کوئی بیماری لگ گئی تھی— دس سال کے لڑکے کے لیے، حمل کا ٹھہرنا اور حمل کا گرنا یا گرانا، اس کی سوچ اور سمجھ کے دائرے میں تو نہیں آسکتا تھا نا؟ ہاں اپنی ماں کے کرب کو محسوس کیا کرتا تھا۔ جب میں اُس کو کُرید کُرید کر یہ پوچھا کرتا تھا۔ ماں تم کہہ رہی تھی کہ بہت جلد میرا بھائی یا بہن آنے والا یا آنے والی ہے۔ کیوں کوئی نہیں آیا۔؟ وہ اپنے لب سی لیا کرتی تھی— جبکہ باپ ہنس پڑتا تھا— بلکہ فاتحانہ قہقہے لگانا اس کی عادت بن گئی تھی—!

میں سولہ سال کا تھا جب میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی تھی جس کی پولیس کو تلاش تھی۔

میں نے اس کو موت کے منہ سے نکال کر اُس کے زخموں پر مرہم لگایا تھا۔ بدلے میں

وہ میری تقدیر اپنی تدابیر سے بدل گیا۔! سوچ اُس کی ہوا کرتی اور عمل میری ہوا کرتی تھی۔قدم سے قدم ملانے کی بجائے سوچ کو عمل پر حاوی ہونا ہماری دن دوگنی رات چوگنی ترقی کا انقلابی طریقہ بن گیا۔اور میں کیا سے کیا بن گیا! ایک بار سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا تو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے رامائن کی کتھا کے لیے گاؤں والوں نے بُلایا ہے۔اور پھر پوچھ تاچھ کے دوران میں نے رامائن اُسی لَے ، لہجے اور اعتقاد سے سُنا دی تھی جیسے مجھے ماں سنایا کرتی تھی،تو بی ایس ایف (B.S.F) کے افسر اعلیٰ مجھے خود اپنی سرکاری کار میں ریسٹ ہاؤس میں چھور کر آیا تھا—! وہ واقعہ یادگار بن کر گویا میرے باپ کے کندھوں پر کئی ستارے بن کر اس کی بدکاری کی تاریکیوں کو اجالوں میں بدل کر بے خوف اور نڈر بنا گئی تھی اور میرے بھی حوصلے کبھی پست ہوئے ہی نہیں—اپنے عزم کی بلندیوں پر چڑھ کر کبھی چرس، کبھی سونے کے لسکٹ اور کبھی پستول وجدید ترین دھماکہ خیز پاؤڈر آر ڈی ایکس سرحد کے آر پار لے کر، میں نے اتنی دولت کمائی کہ اپنی دلیری اور عقلمندی کا ثبوت دے کر، بڑے بڑے شہروں میں رہائشی فلیٹ خرید لیے ہیں جن کا کرایہ ہر ماہ لاکھوں روپے وصول کرتا ہوں— خوب عیش کرتا رہتا ہوں اور جس پر دل آجائے پالیتا ہوں!

اپنے ماں باپ کو گاؤں بھیجا ہے۔زرزین تاجروں کو دوگنی قیمت دے کر، اپنی ماں کے نام کردی ہے۔کاشتکاری کے لیے بہت ہی اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھ دیے ہیں اور رقم ماں کو دیتا ہوں مگر وہ اپنے پتی کے حکم کی غلام ہے۔وہ خوش تو میرے ناخوش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا— میرا باپ اپنے جسم کی بجائے رئیس ہونے کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔

میرا باپ پہلے شراب پی کر یا تو سو جایا کرتا تھا پھر اپنے آپ میرا خود کے سوچے اور تریب دیے قصیدے باآوازِ بلند، آسمان سے مخاطب ہوکر، بولتا رہتا تھا اور اب چوں کہ میری خریدی ہوئی اعلیٰ معیار کی وہسکی پیتا رہتا ہے اس لئے ہر چسکی کے ساتھ گویا وہ پھونک مار کر دہک رہے انگاروں پر ابھری ہوئی راکھ کو ہٹا کر انگاروں سے مخاطب ہوکر، تپش کو محسوس کرتے ہوئے، اپنی شوخیوں کے بارے میں ذکر کرنے کی بجائے اُن گاؤں لوٹ کر آئے سبکدوش فوجیوں کو غموں کے بحر میں پھینک کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کے بارے میں سوچ سوچ کر تڑپتا رہتا

ہے — جبکہ میری ماں میرے نذر کیئے گئے رقوم سے گاؤں والوں کی مدد کرتے ہوئے اپنے والدین کی روایات قائم اور دائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے اور گاؤں والوں کے چہروں پر اپنے من کی آنکھوں سے ابھرتا ہوا نور دیکھ کر بھگوان کو دیکھنے کا دعویٰ کر رہی ہے۔ جبکہ میں دولت کے ایک ایسے پہاڑ کا مالک ہوں جو نمک کے پہاڑ کی طرح کاٹ کاٹ کر اپنا وجود کھو نہیں پاتا ہے۔ نہ موسم کے اثر سے اور نہ زلزلوں کے تاثر سے۔!'' ''کے ایم'' نے پہلی بار کسی کی باتیں صبر و تحمل سے سن کر کہا'' کے ایم متاثر ہوا'' یعنی اب نصیحت کے ساتھ مشورہ بھی مل جائے گا۔

یہ جان کر نند کمار نے درد بھری آواز میں فریاد کی۔ کمپیوٹر مہاراج! میرے پاس دولت تو ہے مگر شہرت نہیں ہے! عزت نہیں ہے!! کیونکہ میرے پاس میری شناخت نہیں ہے۔! یوں لگ رہا ہے گویا ایک تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہونے کے سبب الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی قریب آنے سے اس لئے گریز کر رہے ہیں کہ کہیں ہم پر نہ گر پڑے، لیکن اب لگتا ہے کہ میرا وجود ہی نہیں ہے —!!

میرے پاس سب کچھ ہے۔ رہنے کے لئے ایک شاندار بنگلہ — میں آرام سے دن اور راتیں گزارنے کے لئے ایسی سہولیات جو ہر موسم کی شدت کو کم کر دیتی ہیں۔ یعنی جھلسا دینے والی گرمی کو ٹھنڈی ہوا دبوچ لیتی ہے اور باہر اگر سرد ہوائیں ٹھٹھر رہے جسموں پر قاتلانہ حملے کرتی ہوں، میرے بنگلے کے ہر کمرے میں سہانی آنچ ہوتی ہے —!!

گھر میں نوکر چاکر ہیں اور میں حکم دے کر ایک مہاراجہ کی طرح زندگی گزار رہا ہوں! میرے پاس ایک بدیشی کار ہے اور جب مجھے اپنے فیشن ڈیزائنر (Fashion Designer) کے بنائے ہوئے، طرح طرح کے کپڑے پہن کر کار میں بیٹھتے یا کار سے نکلتے دیکھنے والی ہر نظر مجھ پر جم جاتی ہے مگر کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا ہے۔ میں پہل کروں۔ تب بھی نہیں —!

شہر کی سب سے اچھی کالونی میں سب سے شاندار بنگلے میں رہتا ہوں۔ کالونی میں جہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں وہاں وہ مجھے اپنے قریب آنے نہیں دیتے ہیں اور اگر میں کسی سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہوں تب وہ میرے قیمتی تحائف کو ٹھکرا کر غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے میرے، ان کے گھر سے نکلتے ہی دروازے کے بند کرنے کے انداز سے نفرت کا احساس

دلاتے ہیں—— فقط مجھے اور کسی اور کو نہیں۔ ایک بھکاری کو بھی نہیں!

شہر کی سب سے اچھی کالونی میں سب سے شاندار بنگلے میں رہتا ہوں۔ کالونی میں جہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں وہاں وہ مجھے اپنے قریب آنے نہیں دیتے ہیں اور اگر میں کسی سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہوں تب وہ میرے قیمتی تحائف کو ٹھکرا کر غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے میرے، ان کے گھر سے نکلتے ہی دروازے کے بند کرنے کے انداز سے نفرت کا احساس دلاتے ہیں—— فقط مجھے اور کسی اور کو نہیں۔ ایک بکاری کو بھی نہیں! کیونکہ میں کوئی بھی زبان بول سکتا ہوں مگر پڑھ نہیں سکتا اس لئے صبح سویرے اخبار والا میرے پھاٹک کے سامنے رکے بغیر اگلی کوٹھی کے سامنے رک جاتا ہے۔ میں کل کلب میں جاتا ہوں تو میرے کپڑوں پر چھڑکی گئی بدیشی عطر میری آمد کا احساس دلاتی تو ہے، مگر کلب کے ممبران میرے ساتھ بیٹھ کر، اسکاچ وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے، آمنے سامنے بیٹھ کر، نہ تاش یا شطرنج کا کھیل کھیلنے کی رضامندی دیتے ہیں اور نہ کسی بھی سیاسی، سماجی یا ثقافتی موضوع پر بحث کرتے ہیں—— گویا میں ایک بے رنگ لفافے کی طرح اپنے گھر لوٹ کر آتا ہوں—— روز اپنے عالیشان بنگلے کے گیٹ پر لگی اپنی خوبصورت نیم پلیٹ پر اپنا نام اور اپنا پتا پڑھ لیتا ہوں—— اس کے ساتھ لگے اپنے لیٹر بکس میں جھانک کر دیکھتا رہتا ہوں مگر بجلی، فون، پانی اور کالونی کے دیکھ بھال کے بلوں کے علاوہ کبھی کچھ نہیں دیکھ پاتا ہوں——!

کبھی کبھار خود رقوم جمع کرنے جاتا ہوں یہ سوچ کر کہ کوئی ہمدم کوئی دوست مل پائے مگر بے رُخی کا شکار ہو جاتا ہوں—— بار بار! میں اپنے آپ کو ایک آسیب سمجھتا ہوں جو چہروں کے جنگل میں ہر شناسا یا غیر شناسا چہرہ دیکھ تو سکتا ہے مگر اس کو کوئی دیکھ نہیں پاتا ہے—— اگر کوئی دیکھ پاتا ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے——! گویا میرے چہرے کی معصومیت کی بجائے ان کو ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا ہو۔!! ہاں شہر کے باہر کبھی کسی تیرتھ استھان پر جب کسی کے سنائے گئے سنسکرت شلوکوں کو تصحیح تلفظ کے ساتھ نہ بولنے کے لئے ٹوکتا ہوں تو سامعین مجھے اپنانے کی بجائے میرے بارے میں سوچتے رہتے ہیں—— قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں——! پھر جانے کیا ہوتا ہے کہ میں ایک میلے میں بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں——!!

کمپیوٹر مہاراج میں زندہ تو ہوں مگر اپنی زندگی سے بیزار ہوں — نہ میرا کوئی ہم سفر ہے، نہ میں کسی کاروان میں شامل ہوں — نہ منزل کا تصور ہے۔ نہ پڑاؤ کی شناخت ہے — نہ دن میں کوئی راستہ نظر آرہا ہے اور نہ رات کو جرس کی آواز سنائی دے رہی ہے — ! کیا میں تنہا ہوں! ۔؟؟ پر یوں کیسے کٹ سکے گا زندگی کا سفر —؟ یہ پوچھنے آیا ہوں ۔؟ — کمپیوٹر مہاراج ؟ — ؟؟

کمپیوٹر مہارج نے بے حد متاثر ہونے کا اشارہ دیا تو نند کمار کو نصیحت کے علاوہ رائے دینے کا بھروسہ دلا کر نہایت صوفیانہ انداز میں آواز سنائی دی۔ آواز ''کے ایم'' (K.M) کی تھی — گویا آواز آسمان سے آرہی تھی ۔!۔!!

نند کمار! جو انسان اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں خود جانتا ہے وہ خود دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکتا ہے —

فیصلہ کسی وکیل کے بغیر، جواز وضاحت کے بغیر ہوگا اور ملزم ہی جج بن کر یہ ثابت کردے گا کہ جرم کے دھبے کیسے دھو لیے جا سکتے ہیں —!

غور سے میری باتیں سنتے رہو۔!

تمہارا باپ ہاتھی پر سوار ہو کر، انتقامی ارادوں سے، شناسا لوگوں کو بلا وجہ چیونیوں کی طرح مسلنے کے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ گویا ہر لمحہ لمحوں کے کاروں میں شامل ہو کر، وقت کی طرح چلتا رہتا ہے۔

وقت کبھی رکتا نہیں ہے۔ اپنی طے شدہ رفتار پر چلتا رہتا ہے — کبھی پلٹ کر دیکھتا نہیں ہے — مگر اچھے یا برے نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ تمہارے باپ کو چیونٹیاں اس لئے نظر نہیں آرہی ہیں کیونکہ اس کے غرور کی اونچائی بلند ہے، جبکہ تم دولت کے پہاڑ پر کھڑے ہو کر بھی کسی کو نظر نہیں آرہے ہو۔!

جو نظر نہیں آتا اُس کی شناخت کیسے ہو سکتی ہے۔؟ دھند یا دھول میں چہرہ دیکھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے مگر تمہارے ارد گرد گندک کے دھویں سے آنکھیں جلن کی وجہ سے بند ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تم خود بھی جانتے ہو۔! جانتے ہو نا؟

سانسوں کو بارود کی بدبو دبوچ لیتی ہے — خوف، سوچ اور سمجھ پر دستک دیتا ہے۔

چاہت کے جذبے کو نفرت کی مضبوط گرفت دبوچ لیتی ہے — پھر حالات دوریاں ہی پیدا کرسکتی ہیں۔ نفرت کے جنون سے۔! محبت اگر الفت کا نام ہے تو نفرت ذلت کا نام ہے — ! ہے نا؟

محبت کی خوشبو کو قید نہیں کیا جاسکتا اور نفرت کی بدبو کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ سمجھ گئے نا کہ تمہاری شناخت پر گرہن لگانے والی تمہاری بدبودار دولت ہے! یہ ایک خامی ہے جو تمہیں، باپ کے خون اور پرورش سے ملی ہوئی ہے۔ ملی ہے نا؟

میاں زندگی کی علامت ہے — کپڑوں کو اجلا بنانے والی نیل اُگا دینے والی زرخیز زمین ایک فصل کے بعد چار سال تک بنجر بن کر رہ جاتی ہے۔ قصور زمین کا نہیں ہے — ! کاشتکار کا ہے — !! ہے نا؟ ۔؟؟ وہ چاہے تو نیل کی کاشت کرنا بند کر کے زرخیز زمین میں اناج یا پھول اُگا سکتا ہے، ورنہ اپنے مطلب اور مقصد کو جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ سچ ہے نا؟

ماں نے تمہیں ایک معصوم چہرہ، ایک حساس دل اور شاطر دماغ میں ایک خوبی ڈال دی ہے، وہ ہے تمہاری یادداشت کی انمول خوبی — ! ہے نا؟ تم اپنے اردگرد لوگوں کو نیکی کی حکایتیں سنادو یا گمراہ کن بدی کی داستانیں، یقیناً سامعین پر اثرانداز ہوں گی۔ ہوں گی نا؟

اچھا یا برا تاثر چھوڑ کر سوچ کر اپنے آپ کو سمجھا دو — !

میرا یہ مشورہ ہے کہ تم اپنی شناخت درج کرانے کی کوشش میں اپنے معصوم چہرہ اور یادداشت کو اپنا رختِ سفر بنادو! فائدہ ہوگا یا نقصان یہ اپنی سمجھ سے پوچھ لو!

لیکن نئے سفر میں نئے راستے کا انتخاب تب کرلو جب سوچ تمہارا ساتھ دے!

اور ایک نئی منزل کے خدوخال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کردو — !

میں — مشورے دے سکتا ہوں۔

میرا پہلا مشورہ سن لو — تم دوسرے کسی بڑے شہر میں اجنبی لوگوں کے دل و دماغ میں اپنی شناخت درج کرانے کی کوشش کرو — شاید کامیاب ہو جاؤ — اور اس کے لئے میری رائے میں تم اپنے نام کے ساتھ کوئی انقلابی یا جنونی تخلص جوڑ کر، یا وہی نام مستقل طور پر اپنا کر شاعر بن جاؤ!

اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر—! تخلص اپناتے وقت یہ مت سوچو کہ ''دانش'' تخلص اپنا کر کیا تم نے آج تک کوئی دانش مندی کا کام کیا ہے یا نہیں۔! چوہا بھی اپنی مونچھیں دیکھ کر اپنے آپ کو شیر کا نام دے تو بلی کو اس پر اعتراض کیوں ہوگا ''ڈنکہ'' تخلص اپنا کر یہ کسی کو سوچنے کا موقع ہی مت دو کہ وہ تم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا تم نے اپنی کسی تخلیق سے کسی بھی سیاسی، سماجی، ثقافتی یا اقتصادی موضوع پر ڈنکے کی چوٹ پر معاشرے کو چونکا دیا ہے۔ ہاں مگر احتیاطاً بلی کو دیکھ کر چوہے کی طرح بھاگ جاؤ! چونکہ اب بدل چکے حالات میں شاعر کی پہچان پھٹے پرانے کپڑوں سے نہیں ہوتی ہے بلکہ چار مینار سگریٹ سے مستی میں رہنے کی خاطر شراب پینے یا نشیلی دوائیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ بلکہ شاعر اپنے آپ سے بے خبر ہونے کی خاطر لمبے بال، لمبے ناخن، میلے دانتوں کی نمائش کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے۔ یہ جان کر مان لو! مشاعروں میں چھا جانے کی خاطر نامور شعرا کا کلام رٹ کر ویسے ہی سناتے رہو جیسے ایک چالاک طالب علم نے ''چاند پر میرا تصوراتی سفر'' پر ایک مضمون لکھتے وقت چاند پر کھیلے جانے والے فٹ بال میچ کے بارے میں لکھ ڈالا— وہ اس لئے کہ اُس نے یہی مضمون رٹ لیا تھا— فقط امتحان میں پاس ہونے کی خاطر—! یا پھر اجنبی شعرا کے مشاعروں میں شرکت کی خاطر اپنے آپ کو اردو شاعری کا متوالا ظاہر کر دو—! چاہو تو اپنی دولت کے پہاڑ سے کچھ پتھر نکال کر ماضی کے نشانات کو، اُن سے ہی مٹا کر— ایک ایسا آشیانہ بنا کر— اُس میں چند کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے معقول شعرا کو پناہ دے کر— ان کی مدہوشی میں کہے کلام کو اپنے دیا داشت کے خزانے میں ڈال کر— ان کے کلام کو اپنا کلام بتا کر— اپنی شناخت بنا ڈالو— فائدہ ملے گا شرطیہ! یہ سوچ کر کہ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام کیا تھا وہ ان کے بیشتر مداح نہیں جانتے تھے! پھر اپنے خرچ پر اپنے البم بنا کر خود ہی خرید کر کالا دھن سفید دھن بن جائے گا! اور نئی روشنی میں نند کمار نظر ہی نہیں آئے گا۔ بلکہ ایک شاعر ہی نظر آئے گا— یعنی ایک نئی شناخت نظر آئے گی۔!!

میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کسی گاؤں میں ایک جوگی بن کر رامائن کی کتھا سنانا شروع کرو— پھر—! یہ؟ یہ صہ غور سے سن لو۔ فائدہ ہوگا۔ شرطیہ! ایک کتھا واچک (قاری) نے اپنے آشرم کے باہر ایک چھوٹا مٹکا رکھا۔ مٹکے کے اوپر سفید کپڑا رکھ دیا اور اپنے بھگتوں سے کہا کہ وہ علی

الصبح مٹکے میں، اپنی مالی حیثیت کے مطابق دودھ ڈالیں — تا کہ کس نے کم اور کس نے زیادہ ڈالا یہ کوئی نہ جان پائے کہ کون امیر ہے اور کون غریب! کون بڑے دل والا ہے اور کون کنجوس! دوپہر کو جب اُس نے کتھا سنانے کے بعد اور بھگتوں کے جانے کے بعد، مٹکے پر کپڑا ہٹا کر دیکھا تو مٹکے میں پانی تھا — دودپ نہیں! وہ اس لئے کہ سبھی یہ سمجھ بیٹھے کہ مٹکے میں دودھ ڈالنے والے بے وقوف بھگتوں کی کمی اس ملک میں ہو ہی نہیں سکتی —! اس پر ہنسا جائے یا رویا جائے یہ وہ موضوع ہے جس پر اس دور میں سوچنا نادان لوگوں کا کام ہے — خیر —!

ایک شاطر نام نہاد باباجی نے یہ دیکھ کر — اپنے ٹیپ ریکارڈ پر مشہور گلوکاروں کے بھجن سنا کر، مٹکے میں پہلے ہی دودھ ڈال کر اُس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا۔ لٰہذا پانی ڈالنے والے خالی لوٹے لے کر آ کر جایا کرتے رہے۔ یہ سوچ کر کہ مٹکا بھرا پڑا ہے۔ پھر بابا نے مٹکے کی بجائے دان پاتر (خیرات کی رقوم کے لئے رکھے بڑے بڑے صندوق) رکھ دیے تا کہ دودھ خریدنے کے لئے نقدی حاصل کی جائے — ایسا بھگتوں سے کہا گیا —! جبکہ بابا صندوقوں میں پہلے ہی اپنے کالے دھن کے موٹے موٹے بنڈل ڈال دیا کرتا تھا۔ یوں اُس رقم سے وہ زمین خریدتا رہا اور زمین کی پیداوار بھی اپنے نام کے آشرم کے کھاتوں میں ڈالتا رہا۔ اُس کا چہرہ بھی تمہارا جیسا تھا — معصوم! وہ کچھ لوگوں کی مدد بھی کرتا تھا۔ مگر دکھاوٹ کی خاطر جو عام لوگوں کو ایک سخی بابا کی قابل دید سجاوٹ بن کر تاثیر غریب پروری کے علاوہ تاثیر مسیحائی کا خطاب بن کر —! اُس کو ایک شناخت دے گئی تھی! ترکیب اچھی ثابت ہوئی اس لئے سلسلہ جاری رہا۔

وقت نے کروٹ لی تو بابا عوام کے مسائل حل کرتے کرتے ایک لیڈر بن گیا۔ اور پھر سیاست دان —! بقول اس کے عوام نے اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔! اس لئے تم بھی ویسے ہی بابا بن سکتے ہو —! بن جاؤ تو شناخت بھی مل جائے گی اور عوام پھولوں کی خوشبو کی بجائے بارود کی بدبو کو عطر کے طور پر قبول کر لیں گے یا پھر عادی ہو جائیں گے۔ پھر تم ایک سیاست داں بھی بن سکتے ہو۔ اس آزمودہ ترکیب کو آزمایا جا سکتا ہے! سوچ لو۔ دماغ سے، دل سے نہیں!

اب تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتے۔! بلکہ میں تم سے ایک سوال پوچھ لوں گا —

جواب تمہیں دینا پڑے گا۔ وقت کی قید نہیں — اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ کر — اپنے حالات کو شریک کار بنا کر یا واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے! یعنی اپنے بارے میں یا دوسروں کے بارے میں سوچ سمجھ کر!

☆ کیا تم بغیر شناخت کے زندگی کا سفر طے کرنا چاہتے ہو؟ یعنی حل نمبر ایک۔ ہاں یا نا؟

☆ کیا تم ایک جدید دور کے شاعر بن جانا چاہتے ہو؟ یعنی حل نمبر دو۔ ہاں یا نا؟

☆ کیا تم ایک مہاتما بن جانا چاہتے ہو؟ اتنا ضرور بتادوں گا کہ مہاتماؤں کے بارے میں کوئی بھی ان کے ماضی کے بارے میں کرید نہیں کرسکتا! اور سادھوؤں کے بارے میں اگر کوئی کریدنا چاہے تو بلوا منگل کا سورداس بن جانا یا انگلی حال جیسے دہشت گرد کا ایک بودھ بھکشو بن جانا — ہزاروں سوالوں کے جواب بن جاتے ہیں! بلکہ جانکاری شورش پر حاوی ہونے والے چرچوں کے موضوعات بن سکتے ہیں — میڈیا کے اچھال اور ابال کا مواد بھی بن سکتے ہیں۔

☆ اور اگر تم ایک سیاست دان بن جانا چاہتے ہو —؟ تو سن لو۔ سیاست داں کو جب عوام قبول کرلیتی ہے تب وہ مہاتما گاندھی کی طرح اپنی خامیوں اور اپنی کی ہوئی غلطیوں کو فخر سے قبول کر لیتے ہیں — یہاں تک کہ جب ان کو اپنے باپ کو اپنے باپ کے موت کی خبر سنائی گئی تھی تب وہ اپنی بیوی کے ننگے جسم سے لپٹ کر رہنے کو ترجیح دے گئے تھے! ٹیلی ویژن پر قتل عام کرنے والا دہشت گرد اگر انسانیت کے بارے میں بول سکتا ہے تو تم اپنے کار بد کے واقدات کو کارناموں کی شکل میں کیوں نہیں پیش کرسکتے؟ کمپیوٹر مہاراج نے متاثر ہو کر نصیحت، مشورہ اور رائے کے علاوہ جوبات دینے کے لئے اطلاعات بھی دی ہیں۔ کامیابی کے لئے اہم نقطے بھی —

اب تمہارا جواب ہی تمہاری مشکل آسان کردے گا۔!! ناصح اپنا کام کر چکا ہے!

☆☆

انجلی کی کہانی

ترنم اُس انجلی کی باتیں تو نہیں کر رہی تھی جو رام بھکت ہنومان کی ماں تھی! بلکہ اُس انجلی کی باتیں بھی نہیں کر رہی تھی جو مہاتما بدھ سے پیار کر رہی تھی! وہ جو بھی کہہ چکی تھی وہ اُس بدبخت انجلی کی ایک سچی کہانی ہے جو وہ اپنے ہر جسم کو نوچنے والوں کو سنانا چاہتی تھی مگر وہ بے صبر ہو کر اس کو ایک گدھ کی طرح چونچ مار کر چلے جاتے تھے!

ترنم کے ہر جملے میں شکتی ماں کی ایک سوزیدہ نغمے کی دل چھونے والی آواز سنائی دیا کرتی تھی مگر لمحہ اس کا دماغ یوں اُبل پڑتا تھا کہ وہ ترنم کے بے حد خوبصورت چہرے کو بھاپ سے جلا کر مسخ کرنے کو جی چاہتا تھا تا کہ وہ ترنم کے خلاف فلک شگاف نعرے لگانے والوں کے جوش کو ٹھنڈا کر کے وہ نیک کام کر پاتا جس کے لئے اُس کو ایک غیر سرکاری تنظیم نے خاص طور پر ترنم کو اُس کی بدکاری اور اُس سے معاشرے کو جنسی آلودگی سے پاک رکھے جانے کے لئے نہایت ادب واحترام کے ساتھ بطور ایک منصفہ بلایا گیا تھا، مگر وہ حیران تھی کہ جس عورت کو نعرے لگانے والے نوجوان اور بزرگ اسکول اور کالج کے لڑکوں کو بھی اپنے جال میں پھنسانے کے چکر میں ان کو ہاتھ پکڑ کر اپنے کنجر خانے میں لے جانے کے سنگین الزامات لگانے والے ترنم کے شیریں لہجے ہیں سنے جملے سن کر یوں خاموش ہو گئے تھے گویا ترنم نے اُن سب کے کھلے منہ میں اُبلے ہوئے گرم آلو ڈال دیے تھے جو نہ ان کو کچھ بولنے دے رہے تھے اور نہ آلوؤں کو حلق کے نیچے اتار دینے کی کشمکش میں وہ نظریں جھکا کر کھسک کر واپس کیوں لوٹ کر نہیں آئے تھے! کھچا کھچ بھرا ہال جب مکمل طور پر خالی ہو گیا تو منچ پر ترنم اور شکتی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے

اس لئے میڈیا والوں کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں ان ہی دو عورتوں پر مرکوز ہیں، ہال شور اور خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے-! دونوں ایک دوسرے کے سامنے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کی کیفیت بھانپنے کو کوشش کر رہے اور میڈیا والے ان کی بات چیت کرنے کے لئے بار بار اشارے دے رہے ہیں، مگر بے آواز ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔

شکتی ماں گیروی رنگ کے کپڑوں، گلے میں رودراکش کی مالا ڈال کر، اپنے لمبے اور چمکیلے بالوں کو کھلے چھوڑ کر اور ماتھے پر سیندور کی بجائے چندن کا تلک لگا کر ایک باوقار سنیاسن لگ رہی ہے جبکہ اپنے سر کو ڈھک کر ایک سفید پوشاک میں اپنے پُرکشش جسم کی بناوٹ، ایک پری چہرے پر پڑ رہے دو گڑھوں، چمکیلے دانتوں والی بغیر میک اپ کے گلابی ہونٹوں اور جھیل جیسی گہری آنکھوں اور چہرے پر ایک کم سن لڑکی کی معصومیت کیمرے کی آنکھ سے جھانکنے والی میڈیا ٹیم کے ہر فرد کو ترنم جنت سے بادلوں کی سیڑھیوں سے اتر کر، بادلوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر ایک پری خوش قسمتی سے ان کے کیمرے میں قید ہوگئی ہے۔

شکتی ماں کو وہ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی اونچے خاندان سے اپنا تعلق توڑ کر، خود ہری دوار میں اپنا شراد (پنڈ دان) کر کے رشتے ناطے توڑ کر، دنیا داری سے منہ موڑ کر سنیاسن بن گئی ہے۔ وہ اپنے آشرم میں پوجا پاٹھ کرتی رہتی ہے یا پھر دھارمک (اساطیری) کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے، ہاں مگر، اگر عورتوں کی عزت و آبرو کا تحفظ کرنے والی تنظیم والے اُس کو بطور ایک مہمان خصوصی بلاتے ہیں تو وہ کبھی انکار نہیں کرتی ہے۔ لیکن ایک مخصوص انداز میں۔ یعنی اُس کی آمد پر اُس کی جے جے کار ہونا لازمی ہے۔ میڈیا کی کوریج (Coverage) بھی ہونی چاہئے۔ منچ پر اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہونا چاہئے۔ پھر وہ اپنے معمول کے مطابق چند بھجن سناتی ہے، اس کے بعد کوئی سبق آموز کتھا سنا کر مسئلے مسائل پر غور کرتی ہے، کوئی سنجیدہ معاملہ ہو تو کسی کی وکالت، وضاحت، تجاویز، مفاہمت، کسی کی پکار، فریاد وغیرہ کے پس منظر میں وہ آنکھیں یوں بند کرتی ہے گویا جیوری (Jury) کی بجائے فیصلہ سنانے سے پہلے بھگوان سے منظوری لے رہی ہو! مگر آج ان کی ضروریات پوری نہیں ہوئی تھیں! آمد پر جے جے کار نہیں ہوئی تھی کیوں کہ ہال کے اندر جسم فروش عورت ترنم کے خلاف اشتعال بلکہ اخلاق سے گرے ہوئے نعرے

گونج رہے تھے۔

شکتی ماں کو دوسرا جھٹکا تب لگ گیا تھا جب اس کے ہال میں داخلے کے وقت میڈیا والوں کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں اس کے چہرے کی بجائے نعرے لگانے والوں پر مرکوز تھیں۔ مشکل سے منتظمین نے شکتی ماں کو منچ پر لے کر جوں ہی مائیک اُس کے سامنے رکھ دی، ترنم نے منچ پر جاتے ہی مائیک سامنے رکھ کر بولنا شروع کر دیا تھا۔ ترنم کی آواز میں روانی تھی، گویا وہ نعرے لگانے والوں کو اپنی آواز سرگوشیوں میں وہ سنا رہی تھی جو اُن کی خاموشی کی وجہ سے ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ لوگوں کو سائرن کی طرح اور کچھ لوگوں کو مندر کی گھنٹیوں کی طرح۔ شکتی ماں سمجھ گئی تھی کہ یہی وہ عورت ہے جو جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے اور یوں ایک بازاری عورت ہی ایک سنیاسن کی قدر نہ کر کے اُس کے سامنے سے مائیک چھین سکتی تھی۔ سریلی رس بھری آواز میں سہی ترنم جو بھی کہہ چکی تھی وہ شرم وحیا کی اونچی فصیلوں کو پھاند کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے میرے سنہری بالوں سے گھسیٹ کر ایک خارش زدہ کتے کی طرح شہر کے حدود سے باہر پھینک کر میری لمس سے بچاؤ کرنے والو! مجھے میرے گالوں میں میرے شیطانی گڈوں میں زنگ آلودہ کیل ٹھونک کر میرے چہرے کو داغی کر کے میری طلسمی خوبصورتی کو ڈراونی بنانے والو! میرے جسم کو کالک لگا کر ایک جونک کی طرح مجھ سے لپٹ کر میرا خون چوسنے والو! میرے جسم فروشی کا حشر دکھانے والو! میں نے اپنا دروازہ بند کیا تو بھڑک اٹھے۔ روز میں تم سے کہتی رہی کہ میں بیس سال کی ماڈل یا کال گرل نہیں ہوں بلکہ چالیس سال کی ایک عورت ہوں جس کا جسم اور چہرہ اُس کے دو پیدائشی دشمن ہیں۔ اپنی اصلی عمر بتاتی رہی، ہر کالج کے لڑکے کو یہ احساس دلانے کی خاطر اُسکو مجھ میں اپنی ماں کے عکس نظر آجائیں اور وہ ہوش میں آکر وہ اُس دس سال کی بچی کو ورغلا کر میرے گھر کو کھنڈر سمجھ کر لایا تھا۔ میں نے روکا تو اُس نے خرگوش کو چھوڑ کر بکری کو اپنی مردانہ قوت سے دبوچ ڈالا تھا!"

پھر ایک بزرگ کی گود میں ایک بچی کو دیکھا جو بزرگ کی بیہودہ حرکتوں سے بے خبر چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ میں نے روکا ٹوکا تو وہ بوڑھا بھیڑیا مجھ پر فدا ہو کر میرے گھر میں گھس

آیا......! اور پھر باقاعدگی سے آتا رہا۔ میں نے اس کو یہ سمجھانے کی خاطر کہ بچی اس کی پڑپوتی یا پڑنواسی کی عمر کی ہے پھر بھی وہ اُس بچی کو میرے سے لپٹنے کا انٹری کارڈ (Entry Card) بتاتا رہا۔ چند روز پہلے میں نے اخبار میں ایک دردناک خبر پڑھی تو مجھے انجلی کی کہانی یاد آئی۔

انجلی کے پاپا ایک فوجی افسر تھے اور اُس کی بیوی ایک کتھک ڈانسر تھی۔ انجلی کو ممی کے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اپنے پاپا کے ساتھ لپٹ کر ان کے گیت سنتے سنتے سو جانے کی ویسی ہی عادت پڑ گئی تھی جیسی عام طور پر بچوں کو ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر یا انگوٹھا چوستے سو جانے کی عادت ان کا ایک عیب بن جاتی ہے تو بڑھتی عمر میں بھی چھوٹ جانے کا نام نہیں لیتا، بد بخت انجلی بھی ایک عیب کی شکار ہو گئی تھی جس کا خمیازہ اُس کو بھگتنا پڑا۔

انجلی کے پاپا سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے جب شہید ہو گئے تھے تب وہ پانچ سال کی تھی۔ پاپا نے چوں کہ اپنی مرضی سے شادی کی تھی اس لئے انجلی کی ماں اپنے رشتے داروں سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

انجلی جب بھی کسی لمبے چوڑے گورے اور خوب رو آدمی کو دیکھتی تھی تو اُس میں اپنے باپ کے عکس دیکھ کر اُس کے ساتھ لپٹ جاتی تھی اور سو جاتی تھی۔

انجلی کی ماں کو فقط اپنی بیٹی کی خاطر اشتہاروں کے ذریعے ایک ایسے آدمی سے شادی کرنی پڑی جو پیشے سے ہیرے جواہرات کا تاجر تھا۔ بہت امیر تھا مگر عمر میں انجلی کی ماں سے پندرہ سال بڑا تھا۔ اس کی طلاق شدہ بیوی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی جب کہ دوسرا بیٹا ہوسٹل میں رہتا تھا۔ انجلی کی عمر تب بارہ سال تھی اور اُس کا سوتیلا بھائی اُس سے چھ سال بڑا تھا۔ گھر میں ماں اور ایک پیاری سے چھوٹی بہن آئی تو وہ ہوسٹل چھوڑ کر گھر آ گیا۔ باپ کو بھائی بہن کے پیار سے نفرت کرنے لگا کیوں کہ اپنی بہن کو اپنے باپ کے پسند کے مغربی طرز کی پوشاکیں پہننے سے روکا کرتا تھا۔ سوتیلے بھائی کو ہوسٹل جانا پڑا تو انجلی کے لئے سوتیلے باپ نے ایک مستقل فیشن ڈیزائنر اور میک اپ کرنے والا رکھا گیا اور باپ فخر سے انجلی کو مس ورلڈ بنانے کے خواب دکھاتا رہا اور اُس کو نیم عریاں لباس پہنا کر کیٹ واک (Catwalk) کراتا تھا۔ بیوی کو اُس نے شراب پینے کی لت لگائی تھی اس لئے انجلی اپنے باپ کے ساتھ لپٹ

کر سویا کرتی تھی۔

روزِ صبح سویرے جب ماں بیٹی دونوں کا سر بھاری رہنے لگا تب ماں سمجھ گئی کہ اس کی تیرہ سال کی بیٹی ایک عورت بن گئی ہے۔ گویا ہیرے جواہرات کے تاجر کی منجھی ہوئی چٹکی سے نکلا تیر ماں کے قلب میں جا کر جان لیوا ثابت ہوا۔

ایک بھیڑیے کے غار سے نکل کر انجلی اپنے ماما کے گھر گئی اور وہاں وہ ایک نیا جنم لے کر ایک سیدھی سادی لڑکی کی طرح رہنے لگی۔ ماما کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی کمرے میں وہ اپنے سے چار سال بڑے ماموں زاد بھائی کے ساتھ رہنا پڑا۔ کہتے ہیں قدرت کے کچھ ایسے قوانین ہوتے ہیں جو کہیں لکھے نہیں گئے ہیں مگر عمل میں خود بخود آ جاتے ہیں۔ انجلی بھائی کی کلائی پر راکھی باندھنے گئی تو اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انجلی سولہ سال کی تھی جب اس کے ماما نے اُس کا چھ مہینے کا حمل گرا کر جلد بازی میں ایک ذہنی مریض کے ساتھ شادی کرا دی۔ اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی انجلی کی شادی کے نام پر بربادی کی شروعات تھی۔ نہ دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگی اور نہ شہنائیاں بجیں، بس ایک رسمی پوجا کے بعد دلہن اُس دولہے کے کمرے میں بٹھا دی گئی جو اپنی ماں کے ساتھ ایک بچے کی طرح سونا پڑا تھا، گویا جس غنچے کو ایک شاخ سے جدا کرنے کی بجائے موڑ کر لٹکا دیا گیا تھا وے ادھ مرا چھوڑ دیا گیا تھا وہ کھل تو گیا مگر اُس کو کاٹ کر نہ کسی نے گلدان میں سجاوٹ کے لئے رکھا اور نہ کسی نے رنگ اور خوشبو کی قدر کی ہاں مگر مسل دیا۔ تازگی چھین کر۔ انجلی کو اپنے سوتیلے باپ نے کھلنے سے پہلے گویا آگ میں جھلسا دیا تھا۔ پھر بھی عمر کے تقاضے پورے ہوئے تو انجلی نے اپنے جسم میں تبدیلیاں محسوس کرتی رہی۔ خاص طور پر جب وہ آئینے میں اپنے عکس دیکھا کرتی تھی تب وہ خود بھی اپنے حسن پر فدا ہو جایا کرتی تھی اور پھر عام دیہاتی پوشاک میں بھی اُس کے جسم اور پری چہرے پر اڑوس پڑوس کے نوجوانوں کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ گاؤں کے میلے میں وہ یہ بھول گئی کہ وہ ایک اونچی سوسائٹی سے کئی سال پہلے کٹ چکی ہے، چند دل پھینک نوجوانوں کے ساتھ بے باک ہو کر ناچنا اُس کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ وہ اجتماعی عصمت دری کی شکار بن گئی۔

اپنے باپ کی عمر کے مرد کے سینے سے چمٹ کر اُس نے حال دل سنایا تو وہ رات بھر

اُس کے ساتھ ہی رہا اور تسلی دیتا رہا مگر نہ جانے کب اور کیسے ایک نیک دل انسان میں وہ شیطانی گھس گیا جو ایک سنگین رات کے بعد اُجلی سحر دکھانے کے وعدے کرنے والا اُس کو دن بھر کی تاریکیوں میں دھکیل گیا تھا۔

پھر روز روز اجالوں میں بھی تاریک زندگی دیکھ کر وہ گاؤں سے فرار ہو کر ایک شمشان میں جل رہی ایک چتا میں کو دگئی مگر دور دھونی (Bonfire) کے سامنے بیٹھے ایک سادھو نے انجلی کو بچا لیا۔ چہرے اور جسم جھلس گئے اور سنہری بال بھی جل کر ایک ربڑ کے جلے ٹائر کی طرح بدبودار بن گئے۔ سر منڈوا کر سادھو کی گہری باتیں سن کر وہ سطحی طور پر یہ سمجھ گئی کہ چندن کی لکڑی ہوَن کنڈ میں جل کر راکھ ہو جائے تو وہ بھبوتی (Sacred ash) کہلاتی ہے جو راکھ دریا میں ڈالی جاتی ہے۔ بابا نے اُس کو دھرم اور کرم کی باتیں سمجھا کر اپنے آپ کو راکھ میں تبدیل کرنے کی بجائے بے لوث خدمت کرنے کا مشورہ دے کر ایک مندر میں روز صفائی کرنے کا کام دلایا جب تک اُس کے چہرے پر جھلسنے کے داغ تھے اور سر پر ادھ جلے بال تھے مندر میں آنے جانے والے بھگت اس کو قریب سے گزرنے بھی نہیں دیتے تھے۔ گویا وہ ایک کوڑھ کی مریضہ تھی لیکن جب چہرے کے داغ مٹ گئے اور اس کے سنہری بال ہوا کے جھونکوں سے بے قابو ہو کر لہرانے لگے تب دیوی دیوتاؤں کے درشن کرنے آئے دور دور سے آئے بھگت ایک بے حد خوبصورت جسم، ایک پری چہرے میں پڑ رہے دو پر کشش گڈھوں کو یوں دیکھتے رہے جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھنے کے لئے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں پھر چند دل پھینک جنس زدہ نوجوانوں نے اُس کو ندی پر نہاتے ہوئے دیکھا تو وہ اُس پر بھی ہمدردی کے کانٹے پھینک کر وہ ایک بے سہارا لڑکی کو ایک ان دیکھی آگ میں چلاتے رہے۔ ایک گیلی لکڑی کی طرح یعنی نہ بجھنے دیتے تھے اور نہ جل کر راکھ ہونے دیتے تھے۔ پھر انجلی اپنے آپ سے گھبرا کر بابا کے پاس مدد کے لئے گئی۔ اُس نے دھرم کرم کا حوالہ دے کر ایک مسیحا کی آمد کا یقین دلایا۔

بابا کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ امریکہ سے آیا ہوا ایک نوجوان اپنے بورڈنگ اسکول کے چند دوستوں کے ساتھ موج مستی کے ارادے سے گھنے جنگل کے درمیان واقع اس صدیوں پرانے مندر کے پاس طے شدہ منصوبے کے تحت انجلی کے ساتھ موج مستی کرنے آیا تھا مگر انجلی

کی بناوٹی خوشیوں کے پیچھے ایک لڑکی کے ارمانوں کی چتا دیکھ کر وہ انجلی کو اپنے ساتھ لے گیا تو مندر میں افواہیں پھیل گئیں کہ انجلی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ جو انجلی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا تھا اور بعد میں ہوائی جہاز میں کسی نامعلوم جگہ لے گیا وہ ایک شہید کرنل کا بیٹا تھا اور وہ انجلی کو اپنے آبائی گھر میں لے گیا۔ ایک بہت بڑے مکان کی نگران بنا کر اُس نے ایک سرحد کے نگہبان کی بیٹی کی عزت و آبرو کی حفاظت کا پورا انتظام مرحوم یادوں مثلاً ان کی کتابوں اور سنگیت کی لائبریری کی دیکھ ریکھ کے لئے ایک معقول رقم بینک میں جمع کرنے کے بعد مسیحا وداع ہوا تھا۔ گھر کو گرد وغبار نے کھنڈر بنا دیا تھا اور باغ میں گھاس اتنی اونچی تھی کہ گلاب کے پھول پر گرہن لگ گیا تھا۔

انجلی نے گھر سنوارا تو اپنا بچپن یاد آیا۔ ایسا ہی گھر تھا اُن کا۔ خوب محنت کر کے جب کھنڈر گھر بن گیا تو پھاٹک کھول کر ٹوٹے پھوٹے گیراج کے اندر نوجوانوں کا اپنی معشوقاؤں یا گھر کی نوکرانیوں بلکہ ورغلا کر لائی ہوئی معصوم لڑکیوں کی آبرو تار تار کرنے کی ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں آوازیں تو کیا چیخیں بھی سننے والا کوئی بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ ترنم کو ایک ایسی جگہ اپنی زندگی کے دس سال گزارنے پڑے تھے۔ اُس کی وہاں موجودگی کی وجہ سے پھاٹک بند رہا کرتا تھا اس لئے آوارہ مویشی یا کتے بھی احاطے کے اندر نہیں آپاتے تھے مگر ایک روز وہ معمول کی طرح آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی اور اپنے جسم اور چہرے پر رشک کر رہی تھی یعنی نرگسیت کا شکار ہو رہی تھی تب تیس سال کی عمر میں اُس کے تن اور من میں ایک سولہ سال کی کنواری لڑکی کی طرح عشق محبت اور جسمانی ضرورتوں کا شدت سے احساس ہوا مگر پھر اُس عمر میں ہوئی جنسی اذیتوں کے جسمانی درد اور ذہنی کرب کی یاد آتے ہی وہ چیخ پڑی تھی جس کو سن کر پڑوسیوں کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ ایک بہت بڑے مکان کے اندر تنہا رہنے والی اور تنہا پسند عورت یا تو پاگل ہے یا پھر ڈائن، اس لئے وہ اُس کی پہل کے باوجود اُس کے ساتھ میل جول بڑھانے میں کتراتے تھے مگر ان لڑکوں، نوجوانوں اور درمیانی عمر بلکہ بوڑھوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا تھا، ان کے وہ ایک ایسی دکان ہے جو لین دین کے بغیر صرف پہلی بار زبردستی من چاہی چیز حاصل کر کے بعد میں دکان کو لوٹ کر لے جانے کی ہمت اور جرأت سے اپنے بلند عزم کے ساتھ جانے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس بدبخت کی شروعات تب ہوئی تھی جب اس نے ایک

بچی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز کے بعد اپنے گیرج سے اُس بچی کی چیخ سن لی تھی۔ اندر گھس کر اس نے ایک بھیانک منظر دیکھا تھا۔ تقریباً ساٹھ سال کے بڑے میاں ایک چار سال کی لڑکی کے منہ میں چاکلیٹ رکھ کر اس کے ساتھ وحشیانہ حرکتیں کر کے اپنی جنسی خواہشات کو پوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انجلی نے بچی کو تو بچالیا تھا مگر تب جب خونخوار درندے نے اپنی بھوک مٹانے کی خاطر اُس کو دبوش لیا تھا۔ اُس روز انجلی نے بہت آنسو بہائے تھے مگر اپنے چکنا چور ہوئے دل کو تسلی دے کر جوڑ دیا تھا کہ اُس نے ایک بچی کی آبرو بچانے کی خاطر اپنی آہوتی دی ہے۔ پھر ایک دن ایک گھر میں بارہ سال کی کام کرنے والی لڑکی سولہ سال کے ایک لڑکے کے چنگل سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوئی تھی مگر خود اس کی ہوس کی جوالامکھی کی شکار ہو کر اور یوں انجلی اپنی آہوتی دے کر غنچوں کو، ادھ کھلے پھولوں کو، بلکہ شاداب رنگ برنگی پھولوں کی خوشبو اور رنگت بچانے کی خاطر قربان ہوئی تھی۔

وہ سب زخم دینے والوں کی احساسات کی آگ کو بجھانے کی خاطر انجلی کی بدبختی کی کہانی سنانا چاہتی تھی مگر کوئی اس کی کہانی سننا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ انجلی کا نام سنتے ہی وہ جنسی بھوک کے جنون کا مظاہرے کرتے تھے۔

تنگ آ کر میں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے اور شرط رکھ دی کہ وہ پہلے انجلی کی کہانی سن کر یہ تو سمجھ لیں کہ شکار شکاری کی پڑپوتی، بیٹی، بہن یا ماں ہوسکتی ہے تو میں قابل تعریف عورت سے ایک طوائف بن گئی۔ یہ کہہ کر ترنم خاموش ہوگئی کیوں کہ ہال خالی تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، مگر شکتی ماں کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات دیکھ کر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ترنم کا بولا ہوا جملے اس کو بادلوں کی گرج کی طرح گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جوالامکھی نظر آ رہی تھی۔

ترنم نے مائیک شکتی ماں کے سامنے رکھ دی تو چند لمحات کے لئے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہے جب کہ میڈیا والے باری باری ترنم کو دیکھ کر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے ”عورتیں اپنی عمر بتاتی نہیں اور اگر بتا بھی دیتی ہیں تو اصلی عمر سے بہت کم۔ یہ عورت بیس سال کی ہوگی۔ شرط لگانا چاہو تو میں تیار ہوں۔ چہرہ فوٹو جینک اور جسم

سیکسی ۔ایک ریڈی میڈ ماڈل ،مگر داغدار !بدہوئی مگر بدنام نہیں ۔‘‘

ترنم خاموشی سے شکتی ماں کو دیکھ کر جونہی منچ سے اُتر کر ہال کے باہر جانے کے لئے بوجھل قدموں سے چند قدم چل پڑی شکتی ماں کی آواز سے اس کے قدم تھم گئے۔

’’سفید پوشاک پہن کر کوئی جسم فروش عورت جوگن بن جانے کا ڈھونگ نہیں رچا سکتی ۔تم فریبی ہو۔ دھرم کو چالاکی سے کئے گئے کرم قبول نہیں ۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتی کہ سنیاس لینے والا یا لینے والی خود اپنا شرادھ کر کے اپنے ماضی کو بھول کر کسی کو اپنے بارے میں ، خاص طور پر اس کے ماضی کے بارے میں کسی کے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی ہے۔ پھر تم نے ؟؟ یہ ایک جرم نہ سہی ایک گناہ عظیم ہے ، جس کی سزا تمہیں ملے گی ۔ اور وہ پتھر کی لکیریں کھینچے گی ایک سنیاسن جس کے ماضی کے بارے میں کہہ کر اپنا بچاؤ کرنا چاہا۔ رعایت مل سکتی ہے اگر تم مجھے یہ بتادوگی کہ میرے ماضی کے بارے میں تمہیں کس نے اطلاعات دی ہیں ؟ اور کیں دی ہیں ۔‘‘

میڈیا والے اشاروں سے شکتی ماں کو اونچی آواز میں بولنے کی درخواست کر رہے تھے مگر شکتی ماں آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی کرید کرید کر ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی ’’انجلی کے بارے میں کس نے تمہیں یہ سب بتایا ہے ؟‘‘ ترنم شکتی ماں کو بس دیکھتی رہی ۔ ملتجی نگاہوں سے جب کہ وہ جواب کی منتظر تھی ۔ ’’ترنم ! تم ایک بازاری عورت ہو ؟ کون آیا تھا تمہارے پاس ؟ انجلی کی کہانی بتانے ؟ شکتی ماں گویا ایک کانٹے دار تار سے کریدنے لگی تو ترنم حلیمی سے بول پڑی ۔

’’جن کو میں اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی وہ سب مجھے دیکھتے ہی ہال چھوڑ کر چلے گئے ۔ انجلی میرا نام ہے ۔ وہ نام جو مجھے میرے پاپا نے دیا تھا ۔ انجلی کو ترنم کا نام اُن ہی لوگوں نے دیا ہے ۔ منسوب جن سے میری جسم فروشی ہوئی ۔ نعرے لگانے والوں ، میرے جسم کو چاہنے والوں کی رسوائی تو نہیں ہوئی البتہ ایک ڈراونی خاموشی ہوئی ۔ اچھا ہوا جو آپ نے گیلے چندن کی طرح جل رہی بدبخت انجلی کی کہانی سن تو لی ، مگر دو آنسو بہا دینے کی بجائے آنکھوں میں لالی کیوں ؟ کیا آپ کا نام بھی انجلی ہے ؟ کیا ہماری داستانیں ایک جیسی ہیں ؟ ۔؟؟

شکتی ماں کے چہرے پر اچانک روحانی نور نمودار ہوا اور وہ انجلی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پلٹ کر میڈیا والوں سے مخاطب ہو کر اونچی آواز میں بول پڑیں

''ترنم جیسی عورتوں کو یا لڑکیوں کو سمجھانے کے علاوہ ایک سنیاسن اور کیا کرسکتی ہے'' یہ کہہ کر شکتی ماں تیز گامی کے ساتھ ہال کے باہر گئی اور میڈیا کی روشنیاں اس کا پیچھا کرتی رہیں، ہال میں اندھیرا ہے اور ہال کے باہر اجالا۔ ہال کے میں خاموشی ہے اور باہر خوشی کو ظاہر کرنے والا شور۔ اور شکتی ماں کی جے جے کار کے نعرے! ترنم کی آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی ہیں گویا دہلیز پر بیٹھی وہ ان کا انتظار کررہی ہے جو انجلی کی کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ مگر انجلی کو سرد ہوا کے جھونکے کی طرح ایک گیت دل کو چھو کر بار بار گزر گئی، یہ گیت اس کے پاپا اس کو سنایا کرتے تھے:

دو سکھیاں بچپن کی
ایک سنگھاسن پر بیٹھ کر روپ متی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے۔!!



سامان

چھوٹے قد کے اوتار کرشن کو اپنی قد آور مقبولیت کا احساس تب ہوا تھا جب ممبئی کے ہوائی اڈے پر ایک ایئر ہوسٹس (Air Hostess) نے اس کو اپنا بریف کیس اٹھانے میں مدد کرتے ہوئے ان کو ''بابو جی'' کہہ کر دیا دلایا تھا کہ وہ وہی لڑکی ہے جس کی ماں کے آپریشن کا خرچہ ایک اجنبی افسر اعلیٰ نے اٹھالیا تھا۔

جذبات کی رو میں بہہ کر، لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کر، ماضی کی جھلکیاں یوں سامنے آتی رہیں گویا ایک یادگاری البم میں ترتیب سے رکھی ہوئی تصویریں___ تصویریں جو بول رہی تھیں اور یادیں تازہ کر رہی تھیں۔!

بچپن کی___! جوانی کی___یعنی زندگی کے سفر کی___!

اس کے والدین اُس کو پانچ سال کی عمر میں 'پیارے بابو' کے لقب سے آوازیں دے کر اپنے گھر کے علاوہ محلے والوں کے چھوٹے بڑے کام کرایا کرتے تھے۔

بابو___بازار سے سبزی لے آئے کیا؟

بابو___میرے لئے دوائی لائے کیا؟

بابو___پڑھائی بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے باپ کی دکھ رہیں ٹانگیں دباتے رہو تب تک جب تک وہ سو نہیں جاتے۔!۔!!

بابو___اپنے لئے سبزی خریدنے جانا تو پیسے لینے آنا، تا کہ ہمارے لئے بھی خرید لا سکو! کیا کریں تمہارا دوست برف باری میں گھر سے باہر جانا پسند نہیں کرتا نا!

زندگی کا ایک دشوار سفر طے کرنے کے بعد جب اوتار کرشن ایک افسر بن گیا تھا تب محلے والوں نے، رشتے داروں نے، دکانداروں نے بلکہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں نے اس کو بابو سے بابو جی بنا دیا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً طرح طرح کی امداد لینے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اس کے اسکوٹر پر اپنا سامان گھر سے باہر لے جانے یا گھر کے اندر لانے کے عادی ہو گئے تھے! اس کی مرحومہ بیوی بھی اس کو بابو جی کے نام سے آوازیں دے کر، گھر آئے مدد کے طلب گاروں کی روداد سن لینے کے لئے مجبور کرتی تھی۔!!

ایئر پورٹ کے استقبالیہ ہال میں اپنے بیٹے، اپنی بہو اور دونوں پوتوں کے اُن کے سینوں سے لگائے ہوئے پھولوں کے گلدستے دیکھ کر، ماضی کی یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور وہ نیم دوڑ کر ان کے پاس گیا تھا۔!

اور پھر جب اپنے خاندان کے چاروں افراد، جو امریکہ میں تین سال گزار کر ممبئی میں رہنے کے لئے آئے تھے، نے اپنے وطن کی مخصوص پوشاک پہن کر روایتی انداز میں اُس کے پاؤں چھو کر، استقبال کیا تھا تب آشیرواد دینے کے بعد اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا تھا کہ کیا اُس کا ارسال کردہ سامان ممبئی پہنچ چکا ہے؟ بیٹے نے یہ اطلاع دی تھی کہ سامان آچکا ہے اور سامان کو ''ہال'' میں رکھا گیا ہے۔

اُس وقت اوتار کرشن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ممبئی کے چھوٹے چھوٹے فلیٹوں کے ایک واحد قدرے بڑا کمرہ ''ہال'' کہلاتا ہے، جبکہ اُس کے ذہن میں اپنے گھر کا بہت بڑا ڈرائنگ روم (Drawing Room 20x30) اُبھر کر سامنے آیا تھا۔! پھر اپنے محل نما گھر سامنے آیا تھا — وہ گھر جس کو وہ ایک مکان کی شکل میں خالی خالی کمرے جن کے دروازوں پر تالے بھی نہیں لگے تھے!

ہوائی اڈے سے اپنے نئے گھر تک جاتے جاتے ایک لمبے سفر کے دوران اُس کو اپنے گھر سے جڑی یادیں تعاقب کر رہی تھیں جبکہ بیٹا سمجھ رہا تھا کہ بابو جی تھکان کی وجہ سے سو رہے ہیں۔!

سبکدوش ہونے سے دو سال پہلے جب اُس کی بیوی ایک لاعلاج بیماری کی شکار ہو کر، اس کا ہاتھ جھٹک کر، زمین چھوڑ کر ہوا میں کھڑی ہو کر، ہوا کی طرح نظر نہیں آئی تھی۔ تب اُس

نے یادوں کو چھتری بنا کر، کڑی دھوپ یا برف باری میں اپنا سفر جاری رکھا تھا— مگر اب بھٹک جانے کی بجائے یا بہک کر بھڑ کنے کی بجائے اُس نے اس مکان کو جس کو میاں بیوی نے تنکے سے تنکوں کو جوڑ جوڑ کر اپنا گھونسلہ بنایا تھا اُس کو دیوار پر آویزاں ایک تصویر کی مانند ایک خالی خالی کمرے میں رکھ کر، دروازہ خود ہی بند کر دیا تھا۔!۔!! اور ایک چہکتے مہکتے چمن کو موسم بہار میں خزاں کے حوالے کر دیا تھا۔!۔!!

گویا ایک عالیشان سجے سجائے شادی کے منڈپ پر خود ہی دلہن کے چمک دمک والے کپڑے اتار کر، اس کو بیوہ کا پیرہن پہنا دیا تھا۔!۔

وہ ایک نوحہ گر ہے یا ایک ستمگر؟— جانے کیوں یہ خیال بھی اس کو بار بار چونکا تا رہا— گھر میں برسوں سے موجود قیمتی قالین، اُن پر ہمیشہ بہار پھولوں کی طرح نظر آنے والا فرنیچر، سجاوٹ کے لئے ہر کمرے میں رکھے خوبصورت بت، کھڑکیوں اور دروازوں پر لہک دار شاداب پردے، کمروں میں سردی اور گرمیوں کی شدت کا مقابلہ کرنے والی چھوٹی بڑی، بجلی پر چلنے والی مشینیں، راتوں کی تاریکیوں کو دن کے اجالوں میں بدلنے والی، چھتوں پر لٹک رہیں قندیلیں، کھانے پینے کے لئے طرح طرح کے سودیشی اور بدیشی برتن، کھانے بنانے کے جدید ترین الیکٹرانکس (Electronics)، ہر کمرے میں رکھے پلنگ، لحافیں، کمبلیں، جدید طرز کے گدے (Matresses)، ٹی وی اور پانچ ستارہ، ہوٹلوں کے کمروں جیسے منسلک غسل خانے— یہ تمام چیزیں اوتار کرشن نے ایک لاچار، اپنوں کے ٹھکرائے ہوئے ادھیڑ عمر کے لوگوں کے آشرم کو بطور کار نیکی اور بجائے انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے دان کر دیتے تھے—! بابو جی کا نام شہر والوں نے اپنے دل و دماغ میں کرید کر درج کر لیا تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے آشنا تھا—! مگر اچانک ایک غزل، جو وہ اپنے قریبی دوستوں کے اصرار پر گایا کرتے تھے، کچھ لوگوں کے لئے یادگار بن کر، ذہن میں بطور ایک تلخ حقیقت درج ہو چکا تھا جبکہ چند لوگوں کی سوچ میں سوالیہ نشانات بن کر ابھر کر آئے تھے۔ غزل یہ تھی:

وفائیں کتنی ہی مستقل ہوں
جفا کے خوگر جفا کریں گے

جفا، بابو جی کے چاند جیسے اُجلے چہرے پر ایک داغ کھوجنے والے چند بدخولوگ یہ جان کر حیران تھے کہ ممبئی کا پروگرام طے کرنے کے بعد، چھ روز پہلے جو سامان انہوں نے اپنے کمرے میں رکھا تھا اور جس کو کمرے کی لوہے کی مضبوط الماریوں میں رکھا گیا تھا۔ وہ کیا تھا۔۔۔؟
؟؟۔۔۔

جو بابو جی کی ذاتی نگرانی میں، خاص طور پر بنائے گئے صندوقوں کیا رکھا تھا؟ اور وہ کسی کی مدد لئے بغیر بڑے بڑے ٹرکوں میں رکھ کر، ایک ٹرک میں ممبئی کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔؟۔۔۔ وہ کیا تھا؟؟

پھر جب گھر کے ملازموں نے یہ کہا تھا کہ اپنی بیوی کی بے وقت موت کے بعد پچھلے چار برس کے دوران بابو جی گھر کے ملازموں کو بھی اپنے کمرے میں داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ تب شکوک کے دائرے کی محیط پھیلتی ہی رہی تھی۔

بقول ان کے گھر کے ملازمین کے وہ اپنے بہت بڑے بیڈ روم کی صفائی بجلی کی مشینوں سے خود ہی کرتے رہتے تھے۔۔۔ کسی نوکر کی مدد لیے بغیر۔۔۔!؟

اپنے کپڑے یا دیگر مطلوب چیزیں وہ ملازموں سے دروازے پر ہی روک کر لیے رہتے تھے۔ یوں گویا اُس کو کسی کمرے میں جھانک کر دیکھ لینا بھی گوارہ نہ تھا۔!

حالانکہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں، کھانے کے کمرے میں، گھر کے دیگر کمروں میں، چھت پر بیٹھ کر یا اپنے گھر کے خوبصورت باغ میں بیٹھ کر یگانوں اور بیگانوں کے ساتھ غم اور خوشی کے خیالات، جذبات، احساسات اور محسوسات کے تبادلے کیا کرتے تھے؟ کبھی کبھار چند دوستوں کے ساتھ جام بھی ٹکراتے رہتے تھے لیکن جب وہ اپنے کمرے میں جایا کرتے تھے تب وہ دروازہ بند کر کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی گویا نہیں ہوا کرتے تھے۔۔۔!

اُس کا فائدہ لے کر ان لوگوں کو جن کو چمن کی خوشبو میں بھی اپنی تصوراتی بدبو کا ذکر چھیڑ کر یہ ظاہر کرنے میں آسانی ہوتی کہ بابو جی نے دودھ کی نہر بہا تو دی ہے مگر مکھن نکال کر۔۔۔ یعنی وہ بابو جی کو کالا دھن ممبئی بھیجنے والے ایک مکار کا داغ لگا چکے تھے اور یہ اطلاع ایئر ہوسٹس نے اپنے محسن کو دی تھی غالباً بچاؤ کرنے کی خاطر۔۔۔! وہ اوتار کو کچھ اور بھی بتا رہی تھی اس لئے وہ گھبرا

گیا تھا کیونکہ تمام صندوقوں کی چابیوں کا اس کے بریف کیس (Brief Case) میں ہونے کی وجہ سے خدشات کا بوجھ سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا! اگر صندوقوں کو، اس کے گھر پہنچ جانے سے پہلے زبردستی کھولا گیا تو کیا ہوگا؟ — زندگی میں پہلی بار اپنی ذہانت پر داغ لگنے کا شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس کو اپنے بیٹے کا ایڈریس لکھنے کی بجائے ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر سے خود ممبئی آ کر صندوق لینے چاہئے تھے —! یہ خیال اس کے تذبذب کی وجہ بن گیا تھا نا؟ ۔؟؟ — اس لئے خدشات کا سبب بھی —! —!!

کار میں اس کے ساتھ چپک کر بیٹھا اُس کا بڑا پوتا گود میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر، جانے کیا کھوج رہا تھا مگر کچھ اور دیکھ کر جب بے ساختہ ہنس پڑا تب اوتار کے خدشات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔!

اس سے پہلے کہ وہ پوتے سے پوچھ تاچھ کر لیتا پوتا اپنے مخصوص انگریزی لہجے میں بول پڑا تھا: با۔ بو۔ جے (بابو جی) میں نے سات رنگوں کو — اُسی پروپورشن (تناسب) سے ملا دیا تھا جیسے سورج کی روشنی، پرزم (Prism) میں نظر آتے ہیں۔ لیکن رزلٹ (نتیجہ) غلط نکلا۔ I Mean to say (میرے کہنے کا مطلب ہے) سفید رنگ نہیں بنا پایا۔ ایسا کیوں؟

You must be knowing

اور اوتار اپنی عادت سے مجبور ہو کر جواب سمجھانے سے پہلے شعر بول پڑا تھا:

رنگ باتیں کریں- اور باتوں سے خوشبو آئے

پوتے نے دادا کی بات کاٹ کر کہا تھا You sing so well (آپ اچھا گانا گا لیتے ہو) مگر ایک بار پھر پوتا دادا کے ہل رہے ہونٹوں کو سی کر بول پڑا تھا با- بو- جے، کیا آپ جانتے ہیں کہ آیل پینٹ (Oil paint) کی اویجاد (ایجاد) I mean invention ہیومن فلش (Human Flesh) کو دیکھ کر ہوا! (ہوئی)۔

اوتار نے پوتے کو اشارہ دکھا کر چپ کراتے ہوئے کہا تھا — جبکہ یہ وہ اطلاعات ہیں جو مل جاتی ہیں۔ پڑھ کر، دیکھ کر یا پوچھ کر — میں تمہیں دکھانے کی خاطر اپنے تجربات کے وہ رنگ اپنے ساتھ لے آیا ہوں جن میں تمہیں زندگی کے رنگ ہی تمہارے سوالات کے جوابات

دیں گے —! ذاتی تجربات میں ایک اٹوٹ وابستگی ہوتی ہے!

پوتا اپنے دادا کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا تھا اس لئے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا— اور ضدی ہونے کا مظاہرہ کا اشارہ دکھا کر اپنے شوہر سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی تھی۔

اوتار کے دونوں پوتے الیکٹرانک گیمز (Games) کھیلتے رہے جبکہ اوتار اپنے خیالات اور احساسات کے تسلسل سے یوں وابستہ ہو گیا تھا گویا وہ جو بھی کہہ رہا تھا وہ اپنے پوتے کو سنا رہا تھا، بلکہ سمجھا رہا تھا کہ:

☆ ہاں ہاں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔!

☆ مگر ضرورت کی ماں کون ہے؟— یقیناً تجربات! ذاتی ہوں تو بہتر —!! گویا تجربات میں ضروریات کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔!—!!

اور پھر احساس دلا کر ایجادات کرنے کا خیال دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔! اتنا ہی نہیں، وہ ماضی کو حال سے اور پھر حال کو مستقبل سے، مستقل طور پر جڑے رہنے کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں—! آج کیا ہے، اُس کو آنے والے کل میں کیا اہمیت ہوگی۔ یہ دیکھ لو— یہ میلی کچیلی پچاس برس سے زیادہ، نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی، مصر کی ممیّز (Mummies) کی طرح رکھی گئی۔ یہ لحاف— پھٹی پرانی— ٹانکوں کی مدد سے— اپنے وجود کو بچا کر— اُن قیامت خیز دنوں کی، صدمہ خیز کہانی ہے جب قبائلی حملہ آوروں نے ایک اسکول ماسٹر کا گھر اکھاڑ کر اجاڑ دیا تھا۔ یہ لحاف اُس وقت کے حالات عیاں کر دے گی۔! جب تجربات کے حوالے سے، تمہارے لئے ایک تواریخی دستاویزی ہے— بلکہ ایک انمول ماخذ بھی ہے۔ سال کی پہلی برف باری ہوئی تھی اور اسکول ماسٹر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رات بھر ٹھٹھر ٹھٹھر کر چھوٹی سی لحاف سے سبھی کو ڈھانپنے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہوئے ایک دلچسپ، خود پر گزری کہانی سناتا رہتا تھا— اذیتوں کے احساسات پر قدرے حاوی ہونے کی خاطر—!

حالانکہ وہ کہانی دو سو بار پہلے بھی سن کر، رامائن کی طرح، دلچسپی کا مرکز اس لئے بنجایا کرتی تھی کیونکہ سب سردی کا مقابلہ کر رہے تھے— اور اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ہر رات!— قیامت خیز رات!!

یہ وہی لحاف ہے جو میں نے ایک ماخذ کی طرح اُسی وقت کے ایک ٹین کے ٹرنک میں گویا ٹائم کیپسول (Time Capsule) کی طرح سنبھال کر رکھ لی ہے— تمہیں دکھانے کی خاطر— اسکول ماسٹر کا بیٹا میں ہوں۔! اوتار کرشن! جو تمہارا دادا ہے— اور وہ بی اے (B.A) پاس کرنے کے بعد اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ ایک کلرک بن گیا تھا مگر پوسٹنگ ایک ایسے گرم علاقے میں ہوئی تھی جہاں کے موسم کے مطابق ہمارے پاس کپڑے بھی نہیں تھے، یہ وہ کپڑے ہیں پھٹے پرانے ہیں۔ بوسیدہ ہیں۔ مگر میں ان سے میں بہت پیار کرتا ہوں! میرے تجربات کے جز ہیں یہ سب! چھو کر تو دیکھ لو— بدبو خوشبو میں بدل جائے گی۔! ہیں نا کتابوں میں رکھے پھولوں کی طرح؟— ایک دور کی کہان بیان کررہے ہیں۔ یہ ماخذ!— اکھڑ کر اُجڑ چکی اقتصادیات کی کہانی—!

ہمارے کمرے میں گرم ہواؤں کے ساتھ مچھر بھی ہم پر حملے کرتے رہتے تھے۔ عذاب دہ حملے! پھر ہم نے تمہارے پاپا کے لئے، تمہاری دادی کا ایک زیور بیچ کر ایک چھوٹا سا فرش پر رکھنے والا بجلی پر چلنے والا پنکھا خرید لیا تھا—! پھر بچے کو باری باری گود میں لینے کے بہانے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے لیتے رہتے تھے— یہ وہی پنکھا ہے! تاثیر مسیحائی والا پنکھا—!

میں گھر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر ایک امیر گھرانے کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ ان کے گھر میں بہت ساری کتابیں تھیں اور میں ان کو پڑھا کرتا تھا— دل لگا کر۔! حالانکہ ان کو یہ پتہ بھی نہیں ہوا کرتا تھا کہ کون سی کتاب کہاں ہے—! ہے بھی یا نہیں—! اس لئے اگر میں چوری کرتا تو پکڑا بھی نہیں جاتا مگر جب بھی میں ان کا خوبصورت دنیا کا اٹلس دیکھا کرتا تھا تب چوری کرنے کو جی چاہتا تھا— اس لئے تمہارے پاپا کو دکھا سکوں کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور رنگین ہے—!

بھائی بہن کے جھگڑے میں اٹلس پھٹ گیا تھا تو اٹلس کو پھینکا گیا تھا۔ میں اٹلس ردی کی ٹوکری سے نکال کر اپنے گھر لے آیا تھا تو وہ محلے کے بچوں کو دکھاتے دکھاتے اور ملکوں کے بارے میں معلومات دیتے دیتے سب کا دوست بن گیا تھا—! یہ وہی اٹلس ہے۔! میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا ورنہ اب تک کاغذ کے کیڑوں کی خوراک بن گیا ہوتا— چھو کر تو دیکھ لو، ہے نا

ملائم—! گویا میں نے تمہارے لئے دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے! دنیا کی جغرافیہ تب کیا تھی اور اب کیا ہے— ہے نا ایک انمول ماخذ؟۔؟؟

یہ دیکھ لو یہ خوبصورت پلیٹ (Plate)— تمہارے پاپا کانسی کی تھالی میں کھانا ڈال کر اٹھا نہیں پاتا تھا نا اس لئے میں نے اُس کے لئے خرید کر لائی تھی پہلی بار جنم دن کا تحفہ دینے کی خاطر!—!!

اور ہاں اُسی دن اُ کی جنم پتری بھی مل گئی تھی۔ دیکھ لو— ہماری مادری زبان ''شاردا'' میں لکھا ہر لفظ ہاتھ سے لکھا ہوا ہے اور یہ بھگوان شنکر کی تصویر ہاتھ سے بنائی گئی ہے۔ پھولوں کے رنگوں سے بنائی گئی یہ مصوری کا انمول تحفہ میں تمہارے لئے لایا ہوں!

اب نہ تو زبان زندہ ہے اور نہ لکھنے پڑھنے والے—! تم چاہو تو زبان کی داستاں سنا سکتے ہو، دنیا والوں کو!— تم اگر ایسا کر پاؤ گے تو تمہاری دریافت ایجاد کہلائے گی۔

ہاں— پھر آئی اے ایس (I.A.S) کا امتحان پاس کرنے کے بعد بطور انڈر سکریٹری (Under Secretary) اپنی پہلی تنخواہ سے میں نے تمہارے پاپا کے لئے جو ٹرانسسٹر (Transister) خرید لیا تھا وہ یہی تو ہے—! اور یہ ریکارڈ پلیئر اس کے بعد آگیا تھا۔ پھر ہمارے گھر میں ٹی وی (T.V)، وی سی آر (V.C.R) آ گئے تھے۔ ویڈیو اور آڈیو کیسٹ آتے رہے میری پسند پر—! بلکہ سب کی پسند پر! میرے پاس پرانی فلموں کے بے شمار ریکارڈ ہیں۔ کسی فلم کا نام تو— اس کے ریکارڈز میرے پاس ہیں۔ دیکھ ہو— سن لو!

یہ دیکھ لو موسیقی، سازوں اور آوازوں کا انمول خزانہ۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی کلاسیکل سنگر ہوگا جس کا ریکارڈ میرے پاس نہ ہو۔! استاد امانت علی خاں، استاد حسین بخش کی آوازیں بھی میرے اثاثوں میں شامل ہیں۔ خان صاحب عبدالکریم خاں، پنڈت اومکارناتھ ٹھاکر، بڑے غلام علی خاں جیسے قد آور استادوں کے ریکارڈز میرے پاس ہیں— گویا ان ٹرکوں میں کئی عجائب گھر ہیں!۔ اور خزانے بھی!!

کس کس کا ذکر کروں— خود دیکھ لو۔ سن لو یا دیکھ لو— بس میرے سنگیت کے خزانے میں غزلوں اور گیتوں کے نادر نمونے۔ جو اپنی داستانیں بیان کر رہے ہیں۔ سنا دو دنیا کو اور میری

پچاس برسوں میں جمع کی گئیں کتابیں چھوکر دیکھ لو۔ ادب کی دھڑکنیں اپنے زندہ ہونے کی تصدیق کردیں گی! بقول میرے ہم عصروں کے! سمندر کی عمیق گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک کہیں کوئی متوازی گنجینۂ ادب نہیں پاسکو گے! خاص طور پر شاعری میں اردو کے تمام قلم کاروں کے نسخے پالو گے — غالب، ذوق، داغ، مخدوم، اقبال، نسیم، ظفر، ساحر اور آج کے نامور شعرا کی کتابیں یا پھر جرائد میں چھپے بے مثال تراشے پالو گے۔! دنیا کی بہترین فلموں کے ویڈیوز بھی مل جائیں گے کسی نہ کسی ٹرک میں۔ وقت کی قید نہیں — کیونکہ اپنا اثاثہ تمہیں سونپنے آیا ہوں — ٹائم کیپسول کھود کر نکالا جاتا ہے اور میں ٹرک کھول کر — تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں —! فقط تمہارے فائدے کے لئے۔!

ارے ہاں — تمہاری مرحومہ دادی کی دھارمک کتابیں، مادری زبان میں لکھی گئیں تصوف، وحدت اور شادی بیاہوں میں عام طور پر گائی جانے والی لیلائیں بھی ساتھ لایا ہوں — اور اپنا یہ سرمایہ تمہیں دینے کے لئے لایا ہوں — قبول کرلو! — میرے ننھے پودو! تم آنے والے کل کے فلک شگاف درخت ہو!

اوتار کے تصورات کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ جب ایک عالیشان فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اوتار کے دونوں پوتوں نے خود ہی اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر بنائے گئے ایک خوبصورت پوسٹر پر We Welcome our BABUJEE in our Home کا جوشیلے انداز میں مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو چونکا دیا تھا۔!

اوتار کرشن کی سیمابی کیفیت بھانپ کر اس کے بیٹے نے نہایت ادب واحترام سے اس کو پلنگ پر آرام کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے اپنے بریف کیس سے چابیاں نکال کر ہال میں جانے کی ضد پکڑلی۔!

بیٹا باپ کی نس نس سے واقف ہونے کے سبب مزاحیہ انداز میں اطلاع دے گیا کہ وہ ہال میں ہی بیٹھے ہیں اور چونکہ ہال میں بہت سارے صندوقوں نے جگہ گھیر لی تھی اس لئے وہ اپنے ملازموں کو اطلاع دے چکا تھا کہ بابوجی کا سامان اسٹوریج اپارٹمنٹ میں رکھا جائے۔!

اس سے پہلے اوتار کرشن کچھ کہہ پاتا بیٹے نے وی سی ڈی (V.C.D) میں ایک سی

ڈی (C.D) ڈال کر نہایت ادب واحترام سے کہا—

بابو جی! میری ایک بدیشی کمپنی سے میٹنگ ہے اس لئے جانا پڑے گا—! آپ کے پوتے، اپنی ماں کے ساتھ آپ کی آمد کی خوشی میں ایک پارٹی دینے کے سلسلے میں بازار جا چکے ہیں—!

یہ سی ڈی آپ ہی نے ہمیں بھیج دی تھی۔ ظاہر ہے آپ کی پسندیدہ فلم ہوگی۔ آپ دیکھ لیں—ورنہ آرام کریں—!

اس سے پہلے کہ اوتار کچھ کہہ پاتا اس کا بیٹا چل پڑا—!

اور فلم شروع ہوگئی—!

اوتار نے فلم دیکھی تھی—اور بے حد پسند بھی کی تھی—اس لئے بار بار دیکھ لی تھی—!

اس لئے بار ایک آہ بھر کر، گھر کے ایک ملازم کے ساتھ، اپنا ارسال کردہ سامان دیکھنے گیا—!

ظاہر ہے کہ بلڈنگ کے بیسمنٹ (Basement) میں جانا پڑا—اور سامان کو دیکھ کر سکتے میں آگیا—!

آنکھوں کے سامنے پہلے سنیما ہال کی طرح فلم شروع ہونے سے پہلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ایک کمرے کے اندر سوئچ آن کرنے کے بعد ہی سامان صاف صاف نظر آ گیا۔ گویا وہ فلم منظر بہ منظر فلم کا کلیدی کردار اپنے گاؤں میں اپنی مقبولیت پر فخر کرنے والا، اپنے بے حد خوبصورت جسم پر ایک چیتے کی طرح بناوٹ اور سجاوٹ کے نشانات لگا کر جب شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے، ایک باوقار، خوددار رقاص کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ کسی بھی ناظر کی دلچسپی کا موضوع نہیں بن پایا ہے تو وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جو سرکس میں اصلی چیتے کا رقص یا کرتب دیکھنے جا رہے تھے—ایسا فلم میں دکھایا گیا تھا۔!

رقاص، سرکس کے جوکر کی طرح ہنستے ہنساتے رو پڑتا ہے۔

گویا وہ اپنے آپ کو پہچان کر سجاوٹ اور بناوٹ کو بارش میں دھو کر خود ہی فرش پر لیٹ کر ایک لاش کی طرح نظر آتا ہے۔!۔!

اوتار کو اپنا سامان ویسے ہی نظر آیا—! گویا تابوتوں میں لاشیں!—یا لحد میں ابدی نیند

سو رہے بے روح جسم!

بلکہ اُس کی اشک بار آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی ابھر کر آیا جب اُس نے اپنی مرحومہ بیوی کو پلنگ سے اتار کر، کڑاکے کی سردی میں، ایک برف کی سل پر دیکھا تھا—! وہ بھی اس لئے کہ لاش آخری رسومات کروانے کی خاطر، اپنے امریکہ سے چل پڑے اکلوتے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ سر کے قریب رکھے ایک چراغ کی لو میں—! جبکہ اس کا سامان کس کا انتظار کر رہا ہے۔؟۔ وہ بھی دن میں، ایک نیم اندھیرے کمرے میں۔!۔ وہ سوچتا رہا۔!!

کاش اُس نے خود ہی اپنا انمول اثاثہ کسی قدردان یا مورخ کو سونپ دیا ہوتا—! تا کہ ماضی کی فکر کرنے والے زندگی کے سفر کا ذکر کرتے۔ کھنڈروں میں دریافت کیے گئے ماخذوں کے مانند اس کے سامان کو زبان دے کر—!

بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے جونہی وہ اپنے بیٹے کے فلیٹ میں داخل ہوا تب ایک پسندیدہ آواز سن کر اس کا دل ویسے ہی دھڑکنے لگا جیسے وہ تیس برس پہلے یہ آواز سن کر دل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر، جھوم اٹھا کرتا تھا۔

آواز ہال سے آ رہی تھی اور اوتار کی بہو بے حد خوش تھی کہ وہ اپنے پیارے بابو جی کو ان کی پسندیدہ غزل سنا رہی تھی اور بابو جی کے ساتھ ساتھ وہ بھی غزل گا رہی تھی— غالباً اپنے بابو جی کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر! مرحوم شکیل بدایونی کی غزل کی گلوکارہ مرحومہ بیگم احمد نے یہ ریکارڈ خود اپنے معقول مداح اوتار کرشن کو اپنے آٹوگراف کے ساتھ بطور ایک یادگاری تحفہ میں دیا تھا۔

دور ہے منزل، راہیں مشکل، عالم ہے تنہائی کا
آج مجھے احساس ہوا ہے اپنی شکستہ پائی کا

اوتار کو اپنے خدشات پر اس قدر غصہ آیا کہ وہ خوشی کے آنسوؤں کو روک نہیں پایا! اس کی بہو جانتی ہے کہ بابو جی ایسی ہی کیفیت کے شکار ہو کر غزلیں سننے کے عادی ہوا کرتے تھے اس لئے جب اپنی گرج دار آواز میں چونک پڑی بہو سے یہ جان لینا چاہا کہ اس نے یہ ریکارڈ اُن کے سامان سے تو نہیں نکالا تب سراسیمگی کے عالم میں اس نے انکار کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ ان کے تمام پسندیدہ نغمے، غزلیں، کلاسیکل گاین وغیرہ انٹرنیٹ (Internet) پر

دستیاب ہیں، تب اوتار کو یوں احساس ہوا گویا وہ اپنے سامان کے بوجھ کے نیچے دب کر، اپنا سرمایۂ زندگی کو بکھیر کر جہاں سے اٹھ رہا ہے! کاش اس نے صحیح وقت پر اپنا ذاتی سرمایہ بھی خیرات میں دیا ہوتا تو شاید ایک پھٹی لحاف کسی ننگے بچے کو ڈھانپ سکتی —! پھر شدت سے احساس ہوا کہ اُس کی سمجھ ہی ناسمجھ ہے!! — اور سوچ کھوکھلی ہے!

اچانک اُس کو ایئر ہوسٹس کی باتوں کا آخری حصہ، جو اس نے سن کر ایک خیال بد کی طرح، اپنے ذہن سے فوری طور پر نکال دیا تھا، ایک برق بن کر اس کے وجود پر گر پڑا —!

اس نے اپنے محسن کو سرگوشیوں میں ایک راز کی بات سنا دی تھی اور اس افواہ کے بارے میں اوتار کرشن کو اطلاع دی تھی کہ ان کا خیرات میں دیا گیا سامان آشرم کے منتظمین نے اپنے گھروں میں رکھ لیں ہیں۔ جانکاروں کو یہ اطلاع دے کر کہ وہ سامان کی کل قیمت اوتار کرشن کو بھیج رہے ہیں —! برق کا تاثر اپنی شدت سے ایک کیچڑ میں کھلے، ایک خوبصورت مہک دار، لچک دار اور لہک دار، صدابہار پھول کو غرق کر چکا تھا —!!

اور اوتار کی بہو اور پوتے سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بابو جی آنکھیں بند کر کے غزل سن رہے ہیں یا تھکاوٹ کی وجہ سے سو پڑے ہیں —!

اوتار جاگ رہا ہے اور اُس کو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا ایک ٹھوکر کھا کر، نیند میں چلنے پھرنے بلکہ کام کام کرنے والا، جاگ پڑا ہو —!

اور اپنے سامنے ایک گہری کھائی دیکھ کر لرز پڑا ہو!

بہو نے جاننا چاہا کہ کیا وہ کم عمر میں وفات پانے والے گلوکار مرحوم ماسٹر مدن کی غزل ''یوں نہ رہ رہ کر ہمیں ترسایئے'' سننا پسند کریں گے یا جگ موہن کے نغمے ''مجھے نہ سپنوں سے بہلاؤ'' —! ماضی کو آواز دینا چاہیں گے؟

اوتار کرشن نے لیپ ٹاپ پر سرسری نظر ڈال کر، جب ان تمام نایاب نغموں کے اشارے پڑھ لئے تب پوتے کی ایک نئی نوٹ بک پر اردو میں چند سطور لکھ دیں اور پھر اپنے بریف کیس میں رکھی چابیاں نکال کر، اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سو پڑا —!

شام کو اس کا بیٹا ایک بہت بڑا ''خوش آمدید بابو جی''! لکھا ہوا کیک لا کر جب بار بار

اپنے باپ کے دروازے پر دستک دیتے مایوس ہو گیا تب اس نے اپنی بیوی کو بتایا گویا بابو جی اس عمر میں بھی اپنی طرز کی زندگی جی رہے ہیں۔

کتنے بجے ان کو جگانا ہے کہیں لکھ کر رکھا ہوگا۔؟ وہ بڑبڑانے لگا۔۔۔!

بیوی نے نوٹ بک دکھادی اور یہ کہتی رہی کہ وقت بدل جاتا ہے دن رات بھی اپنے بدل دیتے ہیں بقول بابو جی راگ راگنیوں کی شکل اور تاثر کی طرح! صبح کی راگ جے ونتی اور شام کو راگ مالکونش کہا جاتا ہے۔۔۔! بھیروی رات میں دن میں کبھی بھی گائی جاسکتی ہے، دکھ میں، سکھ میں اسی لئے تو وہ سہاگن راگ کہلائی جاتی ہے۔۔۔ زندگی بھیروی راگ بن جائے۔۔۔ یہی خواہش ہے۔ جبکہ اوتار کا بیٹا یہ کہتے کہتے کہ زندگی میں سنگیت یا فنون لطیفہ سے وابستہ، بے شمار ضرورتوں میں ایک ہے۔ واحد نہیں۔ اپنے باپ کی تحریر پڑھ کر چونک پڑا۔!

وقت بدلتا نہیں۔ چلتا رہتا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا نہیں۔ زندگی یقیناً رنگ بدلتی ہے۔

تجربات زندگی کو بیان کرتے رہتے ہیں۔ کیا؟۔۔۔ یہ سوچ کر سمجھنے کی بات ہے۔!

تصورات خواہشات کو عیاں کرتے رہتے ہیں۔ کیا؟۔۔۔ یہ سمجھ کو سوچنے کی بات ہے!

حالات بدلنے کی خاطر۔۔۔ قول کو عمل کا ہم سفر

اور ہم نفس بتانے کی خاطر۔۔۔ کیوں؟ سوچ سمجھ کر بھی

پاک نگاہوں سے۔۔۔ دور دور تک دیکھنے کی بجائے۔۔۔ نادان انسان

آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر۔۔۔ بھول جاتا ہے کہ

صندوق میں، ایک ماخذ کی طرح۔۔۔ رکھی ایک میلی کچیلی لحاف

کسی ٹھٹھر رہے بچے کو۔۔۔ ڈھانپ کر۔۔۔ زندہ رکھ سکتی تھی۔۔۔!۔۔۔!!

پوتے کی نوٹ بک جو اوتار کے بیٹے کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر یوں نظر آئی گویا ایک ٹوٹ چکے ستون کا وہ حصہ جس پر کچھ کرید کر لکھا گیا ہو۔

اوتار کا بیٹا اپنے باپ کی کیفیت سے آشنا ہے اور سطور کا مفہوم بھی سمجھ گیا ہے۔ بہو بابو جی کے بارے میں فکر مند ہیں جبکہ بیٹا سوچ رہا ہے کہ ایسا کیا ہو سکتا ہے جو اس کے دونوں بیٹے لحاف جیسے سامان میں دلچسپی پیدا کی جاسکے! کہیں بابو جی نے واپس لوٹ کر جانے کے بارے

میں سوچا تو اپنے میں فقط اپنے عکس کو دیکھ کر اگلا قدم اٹھالیا تو—!

کیا بیٹا خود بھی آئینے میں اپنے عکس سے نظریں ملا پائے گا۔؟

یا ایک بار پھر وہ اپنے باپ سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو جائے گا؟۔؟؟



ضدی

اپنے ہی منتخب کئے ہوئے راستے میں، ایک دوراہا دیکھ کر، بھیروی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ سفر جاری رکھا جائے یا پھر روکا جائے؟ بلکہ جاری رکھنے کی صورت میں کون سا راستہ اپنایا جائے؟ کیونکہ ایک راستے پر حال کا سکھ دُکھ نظر آرہا ہے جبکہ دوسرے پر مستقبل کے دھندلے عکس نظر آرہے ہیں!

ایسے بھی حالات ہوسکتے ہیں یہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا!

کل جوگزر چکا وہ عذاب دہ تھا! پورا دن بلکہ گئی رات تک ہر لمحہ تجسس کے دباؤ سے اور رات تذبذب کے کھنچاؤ سے وجہِ اضطراب وتناؤ بن گیا تھا! کیونکہ

دن کو وہ اپنے شوہر رشی راج اور سسر شیوراج کو دیکھتی رہی اور سسر کو ضدی سمجھتی رہی!

جبکہ رات کو یہ جان کر حیران ہوگئی تھی کہ اُس کا شوہر بھی اپنے باپ کی طرح ضدی ہے!

تو کیا جو نظر آرہا ہے وہ ایک فریب تھا؟؟ کیا رشی نے اس کو دھوکہ دیا ہے؟ یا وہ خود ہی اپنی نا سمجھی اور غلط سوچ کی دھند میں دھوکہ کھا گئی ہے!۔؟؟ تو کیا رشی کا یہ دعویٰ کہ وہ اپنے باپ کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر ہی ان کے دیوانہ پن میں شامل ہوجاتا ہے، کھوکھلا ہے؟ سچ اُس کے سامنے آچکا ہے کہ بیٹا باپ دونوں ایک ہی سانچے سے نکل چکے دو ایک جیسے مجسمے ہوتے ہیں! ہاں یہ بات اور ہے کہ مجسمہ نم مٹی یا ریت یا پھر ابل رہے سونے یا موم کا ہوسکتا ہے یعنی عمر کم یا زیادہ ہوسکتی ہے! مگر وقتی سہی، کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے!

رِشی کو اپنا لینے سے پہلے یہ خیال اُس کی سوچ کا حصہ کیوں نہیں بن سکا؟— ؟؟

بھیروی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ لیتی ہے تو بے شمار جڑے ہوئے سوالات جوابات مانگ رہے ہیں!

بھیروی ایک گلورہ ہے اور وہ سمجھ رہی ہے کہ جیسے وہ کسی بھی راگ کی سرگم یا ترانہ سن کر راگ کو پہچان سکتی ہے، ویسے ہی وہ کسی شخص کے قرب میں رہ کر، اپنی نفسیاتی کرید سے یہ جان سکتی ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے یا چھوٹ! مگر کیا رِشی کے بارے میں اُس کی سمجھ اس کی نا سمجھی کا ثبوت بن گئی ہے؟؟ تو کیا وہ خود ہی ایک پرندے کو ہم سفر بنا کر، ایک خوبصورت گھونسلے میں، تنہائیوں میں خوش وخرم رہنے کی بجائے، تنہا رہ رہی ہے؟ ایک چڑیا گھر میں نمائش کی شے بن کر؟ اپنے گھر کے عالیشان کھانے کمرے میں تنہا بیٹھی بھیروی دو گھنٹوں سے اپنے آپ سے سوالات پوچھ رہی ہے؟

آس پاس کی خاموشی اُس کو ایک بیابان کے سناٹے کا احساس دلا رہی ہے! کھانے کی میز سجا کر وہ کئی بار ناشتہ گرم کر چکی ہے! اور رشی کا انتظار کر رہی ہے! معمول کی طرح!! اور معمول یہ ہے کہ گھر کے نوکر اور نوا کرانی، جو میاں بیوی ہیں، علی الصبح گھر کے تمام کام مکمل کر کے اپنے کمرے میں جا چکے ہیں! بھیروی بھی اپنا کام پورا کر چکی ہے! اور اب وہ اُس لمحے کا انتظار کر رہی ہے جب رشی مسکراتے ہوئے کھانے کے کمرے میں داخل ہو کر، میز پر رکھی کانسے کی تھالی کو ڈفلی طرح بجاتا رہے گا! پھر آواز سن کر شیوراج کمرے میں داخل ہو کر اُس کو ڈرامائی انداز میں یہ پوچھ لے گا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ پھر ڈرامائی انداز میں رشی کو دیکھ کر یہ احساس دلا کر کہ تم نے پکارا اور ہم چلے آئے! پھر یہ جھوم کر رشی سے یوں بغلگیر ہو گا گویا دونوں اتفاقاً مل گئے ہوں! اپنی عمل اور ردِ عمل کو بار بار کرتے ہوئے، اشاروں ہی اشاروں میں دونوں ایک دوسرے کی اداکاری کی تعریفیں کرتے رہیں گے! پھر مطمئن ہو کر ڈرامائی انداز میں، ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے رہیں گے! جبکہ بھیروی دور سے، دونوں کو یوں دیکھتی رہے گی گویا وہ ایک فلم دیکھ رہی ہو۔!

ایسا ہونا چاہیے تھا! مگر رِشی کمرے میں آیا نہیں! گھبرا کر، وہ نوکر یا نوکرانی کو بلانا چاہتی تھی مگر گھر کے قوانین کے مطابق ان کو گھنٹی بجا کر، تب بلایا جاسکتا ہے جب شیوراج چاہے! ورنہ

نہیں!! ہاں دن کو جب شیوراج گھر میں نہ ہوتب بھیروی اُن کو بلاسکتی ہے! لیکن آج چاہتے ہوئے بھی اُن کو آواز نہیں دے سکتی ہے!! نہ ساتھ دینے کی خاطر اور نہ مدد کرنے کی خاطر! چونکہ باپ کے بنائے ہوئے قوانین بیٹے نے قبول کیئے ہیں اس لئے بھیروی بھی اُن پر پابند ہے! اس لئے وہ آج کچھ کرسکتی ہے اور نہ کل کچھ کرپائی تھی۔!

کل کے واقعات آج سے مختلف تھے! رِشی نے معمول کی طرح تھالی بجا کر اپنے باپ کو بلایا تو تھا اور وہ آیا بھی تھا مگر رشی سے ایک سوال پوچھ بیٹھا تھا! وہ بھی تُرش لہجے میں!"یہ بتادو کہ آدھی رات کو تم کیا کر رہے تھے؟؟"

رِشی کو ہچکچاہٹ دیکھ کر شیوراج نے یہی سوال کئی بار پوچھا اور ہر بار لہجہ بدل بدل کر! یعنی اپنی کرید میں ڈرامائیت کے بہترین نمونے اپنا کر! یعنی کبھی تجسس کا تاثر ڈال کر، کبھی مزاح کی چاشنی ڈاکرڈاکر! کبھی غصے سے اور کبھی التجا کرتے ہوئے! مگر ہر بار رشی کچھ بولنے کی بجائے اشارے دکھا کر، بقول شیوراج، سوال کو بلاوجہ ایک معمہ بنانے کی کوشش کرتا رہا!

بھیروی کی نگاہیں باپ بیٹے پر جمی رہی تھیں مگر دور رکھے ایک کیمرے کی طرح جو دیکھنے کے علاوہ سن سکتا ہے مگر بول نہیں سکتا! مطلب ایک لاچار تماشائی بن کر! بیٹے کے جواب نہ دینے کی وجہ سے باپ کبھی روٹھ کر، اور کبھی غصے سے بوکھلا کر، ایک کمرے سے نکل کر، دوسرے کمرے میں جاتا رہا! پھر ہر بار بیٹا فوراً پیچھے پیچھے چل کر، منانے کی کوشش کرتا رہا! پھر دونوں جذبات کی رو میں بہہ کر ایک دوسرے کے گلے لگتے رہے! لیکن باپ پھر وہی بات! یعنی اپنی ضد پر قائم ہونے کا اشارہ دے کر باپ جواب طلب کرنا چاہتا تھا! جو بیٹا دے نہیں رہا تھا— ہر بار دونوں بغلگیر ہونے کے باوجود بچھڑ جایا کرتے تھے! ویسے ہی جیسے پارے کے دو قطعے ملتے ہی ایک قطرہ بن جاتا ہے! مگر ذراسی جنبش سے وہ پھر دو قطرے بنکر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں اور یوں سولہ گھنٹوں کا یہ تسلسل جاری رہا تھا!!

پہلی بار سوال سن کر بھیروی غصے سے اُبل پڑی تھی اور چاہتی تھی کہ رِشی، شیوراج سے پوچھ تو لے کہ وہ آدھی رات کو بہو اور بیٹے کے بند کمرے کے باہر کیا کر رہا تھا؟ -!! لیکن اپنے سسر کی عادت کے بارے میں سوچ کر، اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اپنے ہی

دانت سے اگر اپنی زبان کٹ جائے تو دانت کو نکالا تو نہیں جاتا؟ حالانکہ وہ چونکا دینے والے واقعات یاد آتے رہے جو معیوب ہوتے ہوئے بھی میاں بیوں نے قبول کیے تھے! جیسے شیوراج کا گئی رات میاں بیوی کی شب گاہ میں جانے کے لئے بے ہودہ حالات پیدا کرنا اور پھر میاں بیوی کے درمیان پلنگ پر لیٹ کر ٹیلی ویژن دیکھنا! خاص طور پر وہ واقعہ جس کو یاد کرتے ہوئے بھیروی یہ فیصلہ نہیں کر پائی ہے کہ شیوراج کی اُس حرکت پر رویا جائے یا سوچا جائے! عزت کی جائے یا نفرت کی جائے!

تب ہوا یوں تھا کہ شادی کے چند روز بعد ڈاکٹر رشی راج کو تین راتیں ایک میڈیکل کیمپ میں گزارنی پڑی تھیں! ان راتوں کو دونوں اپنے اپنے آئی پیڈ پر ایک دوسرے کے مخاطب ہو کر، مزے لے کر، نجی باتیں کیا کرتے تھے! مذاقاً جسم کے پوشیدہ حصوں کو علامتی نام دے کر! جیسے نندو، شینا مینا وغیرہ! چونکہ شیوراج بند کمرے کے باہر اُن کی باتیں سنا کرتا تھا اس لئے جب رشی گھر لوٹ کر آیا تھا تب باپ نے ایک جاسوسی انداز میں بیٹے سے پوچھا تھا کہ یہ نندو کون ہے؟ شینا مینا کون ہیں؟ بیٹے نے بے باک ہو کر کچھ بول کر اور کچھ جسمانی حرکتوں سے باپ کے سوالات کے جوابات دے کر گرم لوہے کو پانی میں ڈال دیا تھا! پھر باپ کی خوشنودگی حاصل کرنے کی خاطر بار بار عمل اور ردِعمل کے مناظر کو اچھے سے بہتر اور بہتر کو بہترین بنا دیا تھا! اسی لئے تو کل آٹھ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک چل رہے ایک عذاب دہ تسلسل کے دوران بھیروی سمجھ نہیں پائی تھی کہ جب رشی بے باک ہو کر ایسے قابل اعتراض سوالات کے جوابات دیتا رہتا ہے تو پھر اب ایک آسان سوال کو پیچیدہ کیوں بنا رہا ہے؟

بار بار دل چاہتا تھا کہ رشی کو مشورہ یا رائے دے کر وہ جواب دے کر اپنے باپ کیھد توڑنے کی بجائے، خود ہی جھک کر اپنی ہار قبول کر لے تا کہ دوسرے کام جن میں ناشتہ کرنا، دوپہر اور رات کا کھانا، کھالینا بھی شامل تھا! کیے جائیں! مگر لاچار تماشائی کو اپنی موجودگی ظاہر کرنے کی اجازت ہوتی تب نا؟

بھیروی جانتی ہے کہ جب باپ اور بیٹا آمنے سامنے ہوتے ہیں تب گویا دو نقطوں کے درمیان ایک چھوٹی یا بڑی لکیر ہوتی ہے! چوں کہ تیسرا نقطہ آس پاس ہوتا نہیں ہے اس لئے

ایک تکون بن ہی نہیں سکتا ہے! ہاں لکیر کو گھما کر جو دائرہ بنایا جاتا ہے اُس میں بھیروی کو داخل ہونے تو دیا گیا ہے مگر محیط پر رہنے کی حد تک! ظاہر ہے کہ وہ دونوں کے قریب جا نہیں سکتی ہے! بلکہ اپنے شوہر کو مشورہ بھی نہیں دے سکتی تھی! ہاں اگر ایک سرد جنگ رُک جاتی تب وہ رشی کو جنگ بندی کے بعد جنگ ختم کرنے کے لئے مجبور کر سکتی تھی! مگر جنگ بندی ہوتی تب نا! جنگ بندی اُس صورت میں ممکن ہوسکتی تھی اگر کوئی اتفاقاً باپ بیٹے کے درمیان آجاتا! تب شاید نفسیاتی دباؤ میں آکر وہ ایک دوسرے کے جنونی اثر سے آزاد ہو جاتے! اور پھر بھیروی ایک سنہری موقعے کا فائدہ لے کر رِشی کو جواب دینے کے لئے رضامند کر دیتی! بھیروی جانتی تھی کہ دونوں کے درمیان کوئی بھی نہیں آسکتا ہے!

گھونسلہ نام کے ایک عالیشان بنگلے میں صرف دو پرندے رہتے ہیں!

بیس برس پہلے شیوراج کے والدین بھی اُن کے ساتھ رہتے تھے لیکن ایک کار کے حادثے میں ان کی موت کے بعد بنگلے میں باپ بیٹے کے علاوہ کوئی نہیں رہتا ہے! دونوں سے ملنے کوئی بھی یگانہ یا بیگانہ نہیں آتا ہے یعنی دونوں پرندوں سے نہ کسی رقیب، حریف، حلیف کا آنا جانا ہے نہ کوئی چوہا بلی یا سانپ اندر گھس کر ان کو ڈرانے آتا ہے! یعنی نہ محلے والوں کا نہ رشتے داروں کا اور نہ ناطے داروں کا آنا جاتا ہے! گھر کے نوکر، نوکرانی بنگلے کے ساتھ جڑے ایک کمرے میں رہتے ہیں! علی الصبح گھر کا سارا کام ختم کر کے وہ چلے جاتے ہیں! وہ تب باپ اور بیٹے کے سامنے آجاتے ہیں جب اُن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ایک ڈرامائی انداز میں گھنٹی بجا کر! ورنہ وہ پاس نظر آجانے کی جرأت نہیں کرتے ہیں! ہاں بھیروی کی شادی کے بعد، یعنی پچھلے سو دنوں کے دوران، بھیروی کے اصرار پر نوکر نوکرانی دن کو بھی گھر میں نظر آتے رہتے ہیں مگر تب جب شیوراج اور رِشی راج دونوں باہر ہوں! ورنہ نہیں!!

بھیروی یہ جان چکی ہے کہ رشی کو ملنا جلنا اچھا لگتا ہے! ہاں یہ بات اور ہے کہ باپ کے سامنے ہوتے ہوئے اس کی سوچ سمجھ بلکہ عمل اور ردِ عمل باپ کی کارکردگی کا عکس ہوا کرتی ہے! لیکن بیٹے کو باپ آئینہ نظر آتا ہے یا پیکر یہ بھیروی نہیں جانتی ہے! وہ رشی راج کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے آشنا ہے اور یہ جانتی ہے کہ اُس کے لئے ساری خدائی ایک طرف اور

اُس کا باپ ایک طرف! باپ کے جنونی پیار اور لگاؤ کے ساتھ ساتھ اکثر بیٹے کی فرماں برداری پر اُس کو پیار آ جاتا! غصہ نہیں!! وہ اس لئے کہ رشی نے اپنے باپ کے بارے میں کبھی کچھ بھی نہیں چھپایا ہے!! شیوراج کے بارے میں بھاسکر نے بھی اس کو خاصی اطلاعات اس لئے دے دی ہیں تا کہ وہ اپنے سسر کی معیوب حرکتوں کو نظر انداز کرتی رہے اور رشی کی دنیا کو ضیا بخش سکے! وہ دونوں سے بہت پیار کرتا ہے نا!

شیوراج شہر کا ایک مشہور اور معروف ایڈوکیٹ ہے جبکہ رشی راج ایک بہت ہی کامیاب سرجن! بھاسکر شیوراج کا ہم عمر رشتے کا بھائی ہے! وہ واحد رشتے دار ہے جو بھیروی سے فون پر باتیں کرتا رہتا ہے!

رشی راج اُس کی پہلی ملاقات چار برس پہلے، پرانی دہلی ایک گلی میں واقع ایک فرسودہ عمارت میں ہوئی تھی! بھیروی وہاں موسیقی کی تعلیم لے رہی تھی جب کہ رشی استاد کے پاس کبھی کبھار آیا کرتا تھا! دہلی کے ایک میڈیکل کالج کا ایک طالب علم، استاد کی گائیکی کو روح کی خوراک سمجھتا ہے اور اپنے ہرتناؤ کو کم کرنے کا نسخہ سمجھتا ہے اس لئے وہ استاد کی صحبت میں گزارنے آیا کرتا تھا! سکون بخش خوبی بھیروی کی گائیکی میں بھی ہے مگر یہ خوبی پہلی ملاقات میں فلمی انداز میں نظریں ملتے ہی پیار یا محبت کی وجہ نہیں تھی! شادی چار سال تک ساتھ کاٹے ہوئے سفر کی ایک حسین منزل ہے! دونوں ایک منطقی سوچ اور سمجھ کی ہم آہنگی کے سبب ہی ہم نس اور ہم نوا بن گئے ہیں! اس لئے دونوں ایک دوسرے کو بخوبی جاننے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں! شیوراج کے بارے میں، رشی اور بھاسکر کی دی گئی اطلاعات کے علاوہ اُس کی اپنی قائم کی گئی رائے، اگر قدم قدم پر صحیح ثابت ہو چکی ہے! پھر رشی کے بارے میں غلط کیوں ثابت ہو رہی ہے! کیا آج اُس کا دعویٰ اپنے شوہر کی غیر متوقع ضد کی ٹکر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا؟—!!

شیوراج کو اپنے بیٹے سے جنونی لگاؤ ہے! یہ بھیروی اُس دن بھانپ گئی تھی جب وہ جان گئی تھی کہ وہ ہر چھٹی یا چھٹیاں بیٹے کے ساتھ دہلی میں گزارنے کے لئے ہر سال کالج کا کلینڈر دیکھ کر، رات کی ریل گاڑیوں میں آنے جانے کی ٹکٹیں خرید کر رکھا کرتا تھا۔ رات کو سفر، دن بیٹے کے ساتھ گزار کر پھر اپنے گھونسلے میں واپسی! ابابیل کی طرح!

شیوراج پر فلموں کا اثر ہے، یہ وہ اپنی پہلی ملاقات میں جان گئی تھی!

ہوا یوں تھا کہ ایک اجنبی لڑکی کو، متاثر کرنے کی خاطر شیوراج اپنا ہر ایک مکالمہ، طرح طرح کے ڈرامائی انداز میں ادا کرتے ہوئے، یہ جان لینے کو کشش کر رہا تھا کہ شاٹ ٹھیک ہے نہیں! بناوٹ اور سجاوٹ کے طور پر! کیونکہ بھیروی کیمرے کے پیچھے رہ کر یا آگے رہ کر، جس مصنوعی اظہار سے ادب کر اپنے باپ کی فلم ٹھکرا کر، اپنے نانا نانی کے پاس دہلی آئی تھی وہی سب کیمرے کی آنکھ کے بغیر، اصل زندگی میں دیکھنا قبول تو نہیں تھا! خاص طور پر جب رشی بھی باپ کی عمل اور ردِ عمل میں جگل بندی کے تاثرات دیتا رہتا تھا! مگر پھر یہ جان کر کہ رشی نے اپنے باپ کا فلمی اسٹائل فقط اپنے باپ کی سنگت کے لئے چن لیتا ہے جبکہ اپنی ذاتی طور پر وہ بھی ایسے عمل سے نفرت کرتا ہے، اس لئے بھیروی نے سسر کو احترام کے ساتھ قبول کیا تھا!

بقول بھاسکر شیوراج کو بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا چسکہ لگ گیا تھا! شروع شروع میں فلم کے ہیرو کے گانے، ان کی چال ڈھال میں گایا کرتا تھا! پھر مکالمے ادا کرنے کی عادت پڑ گئی تھی! کالج میں پڑھائی کے دوران ایک بہت ہی امیر والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے فائدے لے کر، وہ ویسی ہی پوشاکیں پہنتا رہا جیسی فلموں کے ہیرو پہنا کرتے تھے! پھر ان کی نقلیں بھی کرتا رہتا تھا! رفتہ رفتہ اپنے آپ کو فلموں کے کرداروں میں ڈالنا اُس کی ایک عیب نما عادت بن گئی ہے!

تب وہ یونیورسٹی میں قانون کی پڑھائی کر رہا تھا جب اُس نے پہلی بار ایک فلم کی شوٹنگ دیکھ لی تھی! اور وہ جان چکا تھا کہ کیمرے کے پیچھے بیٹھا ہدایت کار ہے! ایک بار نائی کو بار بار بال کاٹنے کے اصرار کی وجہ سے وہ جوکر بن گیا تھا! نائی ہنس پڑا تھا تو وہ اپنا غصہ پی کر ڈرامائی انداز میں قہقہے لگا بیٹھا تھا جبکہ بھاسکر اپنے اردگرد ہر چہرے پر ایک جیسے تاثر دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا!

فلموں میں کوئی تواریخی کردار دیکھ کر یا اساطیری کردار دیکھ کر، کسی کینسر کے مریض کو دیکھ کر یا کسی مزاحیہ کردار کو دیکھ کر، وہی گیٹ اپ، وہی مکالمے، وہی اندازِ بیان اپنا کر، زندگی کا سفر کرنے والے باپ نے اپنے بیٹے کو، اپنے لئے اور بیٹے کے لئے خود کو ہدایت کار بنا ڈالا ہے!

صحیح ادائیگی کا اشارہ دینے کی خاطر! بقول بھاسکر، شیوراج عمر کے فاصلے کو کم کرنے کی خاطر ہمیشہ اپنی عمر میں جتنے برس کم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اتنے ہی برس رشی کی عمر میں جوڑ دیتا رہتا ہے! اور یوں اپنی عمر نہیں بدلتا ہے!

رشی دس برس کا تھا جب شیوراج اس کو کالا کوٹ پہنا کر، اپنے ساتھ کورٹ میں لے گیا تھا! پھر تازہ ترین دیکھی ہوئی فلم میں، جرح کی کامیاب نقل اتار کر، کیس جیت گیا تھا! تب سے اب تک جب بھی وہ جرح کرتا رہتا ہے اس کے مخالفین بھی اُس کی اداؤں پر نثار ہو جاتے ہیں اور وہ ہر مقدمہ جیت جاتا ہے!

شیوراج اسکول میں، کالج میں، یونیورسٹی میں اور تب سے اب تک جو بھی کر چکا ہے یا جو بھی کر رہا ہے ویسے ہی کر رہا ہے جیسے وہ فلموں میں دیکھتا رہتا ہے! روکنے ٹوکنے والوں سے وہ دور رہتا ہے! گھر میں وہ رشی سے ہی نظریں ملا کر، باتیں کرتا رہتا ہے! گھر میں وہ رشی سے ہی نظریں ملا کر، باتیں کرتا رہتا ہے! ورنہ وی سی ڈی (V.C.D) پر پُرانی فلمیں دیکھتا رہتا ہے!

گھر کے باہر وہ اپنے چار عدد ایجنٹوں کی مدد سے ہی لوگوں سے رابطہ قائم کرتا رہتا ہے! چاروں ایجنٹ مالی فوائد کی خاطر اُس کی ہر فلمی طرز کی عمل کا فلمی طرز میں ہی ردِ عمل کرنے میں ماہر ہیں اور چاروں اُس کے اسکول کے ساتھی ہیں! لیکن لڑکپن میں اپنی مطلوب اداکاری کے عوض فلمیں دیکھنے والے، اب اپنے ہنر سے شیوناتھ کی لاکھوں کی آمدنی کے معقول حصے دار بن گئے ہیں! لیکن وہ بھی گھر نہیں آسکتے ہیں! اُن کی مدد سے اپنے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جو بدصورت ہونے کے علاوہ عمر میں شیوراج سے چار سال بڑی تھی! ایک غریب گھر کی لڑکی اور ایک پرائیویٹ اسکول میں موسیقی پڑھایا کرتی تھی اور ریڈیو پر گانے گایا کرتی تھی! جب ایک فلمی طرز میں شیوراج اپنی نو بیاہتا بیوی کو گھر لایا تھا تب پڑوسیوں نے طنزاً کہا تھا کہ شہنشاہ کے کندھوں پر باز کی بجائے چیل بیٹھ گئی ہے!

ہوا یوں تھا کہ ایک تہوار کی رسومات کے دوران وہ پھولوں کی مالا جو اُس کو شیولنگ پر چڑھاتی تھی، بے قابو بھیڑ کی وجہ سے وہ ایک انجانی لڑکی کے گلے میں ڈال گیا تھا! بالکل ویسے ہی جیسے ایک فلم میں، ہیرو نے ایک بدشکل پجارن کے گلے میں مالا ڈال دی تھی! والدین کی

مخالفت کے باوجود اُس نے اپنے چار ساتھیوں کی مدد سے بالکل فلمی طرز پر ایک مندر میں شادی کی تھی! تب شیوراج کی عمر بیس برس بھی نہیں تھی!

شیوراج شادی کے ایک برس بعد ہی باپ بن گیا ہوتا مگر بقول بھاسکر، جو اُن دنوں شیوراج کے گھر میں رہتا تھا، بیوی نے وقت پر اپنے شوہر کو اپنی زچگی کے درد کے بارے میں اطلاع دیتی تھی! مگر شیوراج نے اپنی ماں، نوکرانی یا گھر میں موجود افراد کی مدد لینے کی بجائے بیوی کو گود میں اٹھا کر اسپتال لے جانا چاہا تھا! بوجھ بھاری تھا اس لئے سنبھالنا ناممکن تھا! بیوی فرش پر گر پڑی تھی اور حمل گر گیا تھا! اس کے بعد وہ زنانہ امراض کی ایک نمائش بن گئی تھی۔ شادی کے چار سال بعد رشی کو جنم دے کر وہ ایک طویل بیماری کے بعد مر گئی تھی! رشی تب آٹھ سال کا تھا اور شیوراج کی عمر صرف بتیس سال تھی!

بیماری میں اپنی بیوی کی ڈرامائی خدمت کرنے والا شوہر شیوراج، رشی کو ماں کا پیار بھی دیتا رہا! حالانکہ گھر میں اس کے والدین کے علاوہ بھاسکر اور اُس کی بیوی بھی موجود ہوا کرتے تھے! ایک خوددار فلمی ہیرو کی طرح وہ نہ تو کسی کی مدد طلب کیا کرتا تھا اور نہ قبول کیا کرتا تھا! وہ امداد جو عورتیں ہی عورتوں کو دے سکتی ہیں، وہ بھی نہیں! جب اُس کی بیوی کی چتا اَگنی دان (آگ) مانگ رہی تھی تب شیوراج ایک فلمی ہیرو کی طرح چند جملے بار بار بولتا جا رہا تھا! ہر بار اپنی ادائیگی کو متاثر کن بنانے کی خاطر ایک رنجیدہ ماحول پر گرہن ڈال رہا تھا! وہ چتا سے مخاطب ہو کر بولتا جا رہا تھا کہ بھگوان نے رشی کی ماں کو اٹھا لیا تو وہ کچھ نہ کر سکا! مگر وہ ایک سوتیلی ماں کو اس کا باپ چھین لینے نہیں دے گا!

اُس بار بھی جان پہچان کے لوگوں کو شیوراج پر غصہ آتا تھا جب کہ غیروں کو اُس کے ارادوں میں دم نظر آیا تھا! اُس دن اگر بھاسکر، شیوراج کو اپنی بہترین کارکردگی کا بھروسہ نہیں دلاتا تو ارد گرد لوگوں کو ایک اور عذاب دہ گھنٹے کو برداشت کرنا پڑتا!

شیوراج نے واقعی دوسری شادی نہیں کی ہے! اور نہ اُس نے کسی اور کو اپنی دنیا میں آنے دیا ہے! یعنی رشی ہی اس کی دنیا ہے! اس لئے ہم شکل، ہم خیال ہونے کے ساتھ باپ بیٹے کی سوچ سمجھ اور عمل میں ہم آہنگی ہے! وہ بھی اس حد تک کہ جہاں باپ رک جاتے تو بیٹا وہاں

سے شروع ہو جاتا ہے! عمل میں بھی اور ردِ عمل میں بھی! یعنی دو جسم ایک جان ہیں باپ بیٹا! ایسا دونوں کے جان پہچان والے سمجھ رہے ہیں! دونوں کے بارے میں بیشتر شرارت آمیز باتیں مشہور ہو چکی ہیں! مثلاً کیا دونوں کھانا کھاتے ہیں یا ایک کھالے تو دوسرے کا پیٹ بھر جاتا ہے! کیا دونوں میں ایک ہی سہرا باندھ لے گا اور سہاگ رات دونوں کی ہوگی! کہیں باپ عدالت کو اسپتال اور بیٹا آپریشن ٹیبل پر مریض سے جرح کر بیٹھا تو؟ لیکن بھاسکر اور بھیروی کو معلوم ہے کہ رشی کا اپنا تشخص ہے! اپنی سوچ ہے اور سمجھ ہے! سب سے اہم یہ کہ وہ ضدی نہیں ہے اس لئے تو اس کی عمل میں لچک ہے! مگر آج اس کی سوچ سمجھ اور عمل میں لچک نہیں ہے! ہوتی تو بھیروی کے سوال کا جواب دے چکا ہوتا یا اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے، شیوراج کے دروازے کے باہر باآواز بلند بتا چکا ہوتا کہ میاں بیوی ایک ایسی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے جس میں جنسی تعلقات کو جسمانی عمل سے اجاگر کرنے والے بہت سارے معلوماتی مناظر تھے۔!

لیکن ایسا نہیں ہوسکا ہے! حالانکہ بھیروی کو عارضی طور پر ایک عذاب دہ تسلسل کو توڑنے میں کامیابی مل گئی تھی اور یوں اپنے شوہر سے بات کرنے کا ایک نادر موقع بھی ملا تھا! تب جب گئی رات بھیروی نے اپنے کمرے میں اپنے آئی پیڈ پر، اپنے ہی ایک رشتے کے بھائی کو گفتگو کے لئے مدعو کیا تھا! اونچی آواز سن کر شیوراج چونک پڑا تھا اور یہ جان کر کال (Call) امریکہ سے ہے تو اس نے جنگ بندی کا اعلان کر دینے کے بعد رشی کو اپنے کمرے میں جانے کا حکم دیا تھا! حالانکہ دروازہ بند کرتے ہوئے رشی یوں ظاہر کر چکا تھا جیسے بھیروی نے اس کی ڈوب رہی سانسوں کو تھام لیا تھا! مگر جب وہ مقصد سے دور بھاگ کر گہری نیند کا سہا لیتا رہا تب رشی کے بارے میں اس کی رائے کروٹیں بدل رہی تھیں! اور یوں ساری رات کروٹیں بدل بدل کر کٹ گئی تھی! بار بار وہ رشی سے پوچھتی رہی۔ رشی تم باپو جی کے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو جبکہ رشی جواب دیئے بغیر سوتا رہا۔ ساری رات۔

دن کے دو بج چکے ہیں اور بھیروی کو یقین ہو گیا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں جاگ رہے ہیں! مگر اپنی اپنی ضد کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرنا چاہتے ہیں!! بھیروی کو یقین ہو گیا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں کی فطرت اور خصلت ایک جیسی

ہے! جیسے تالاب کے کنارے بیٹھی مینڈک اور ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھی مینڈک، برسات کے موسم میں ٹرٹرٹرٹر کی آوازوں سے اپنی شناخت کرا دیتی ہیں؟ ویسے ہی ضدی باپ اور بیٹے نے اپنی شناخت کرادی ہے!

اس سے پہلے کہ بھیروی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کر پاتی وہ اپنے کمرے میں داخل ہو چکی ہے! دروازہ بھی بند کر چکی ہے! اور یہ جان کر اور بھی خوفزدہ ہو رہی ہے کہ رشی کے ہوتے ہوئے بھی کمرے کے اندر بھی اتنا ہی سناٹا چھایا ہے جتنا بنگلے کے دوسرے کمروں میں! اپنی آواز میں لرزش پر قابو پا کر اُس نے رشی سے پوچھ بیٹھی ہے، رشی میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہے ہو؟ تم اپنے باپ کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے ہو! میں مجبور نہیں کروں گی! مگر میرے سوال کا جواب تمہیں دینا پڑے گا؟ آخر تم ایک یا دو جملے بول کر اپنے باپ کی بھوک ہڑتال توڑنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ کیا میں اپنے خدشات کو صداقت کا پیراہن پہنا کر تمہیں بھی اپنے باپ کی طرح ضدی سمجھ بیٹھوں؟ آخر تم جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟؟

یہ سن کر رشی ایک گیند کی طرح اُچھل کر بول پڑا ہے!

وہ اس لئے کہ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتا ہے! یہ بتا دینے میں کہ تم بالغوں کے لئے ایک اطلاعاتی فلم دیکھ رہے تھے کوئی دقت یا ہچکچاہٹ نہیں ہے! ڈر تو اُس خوف کا ہے کہ جو قہر انگیز ہو سکتا ہے کہ اگر شیوراج نے یہ فلم اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ دیکھنے کے لئے کہا تو وہ ایسا کر نہیں پائے گا! وہ دوسری کوئی فلم بھی نہیں دکھا سکتا ہے کیونکہ وہ باپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا ہے!! رشی کی آواز میں لرزش ہے مگر سچائی بھی ہے!

اس لئے بھیروی سکتے میں آ گئی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور یہ منظر کسی فلم کا چربہ نہیں ہے!

اچانک ایک آواز نے دونوں کی خاموشی توڑ دی ہے اور وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں! غیر متوقع واقعہ دیکھ کر وہ مسرت بخش سراسیمگی کا شکار ہو چکے ہیں!

شیوراج کانسی کی تھالی ایک ڈفلی کی طرح بجا رہا ہے، ایک مشہور اداکاری کی نقل اتار کر وہ ناچ بھی رہا ہے!

رشی بھی جھوم جھوم کرناچتے ہوئے اپنے باپ کی عمل ردِعمل کا مظاہرہ کررہاہے! باپ ایک فلمی انداز میں روٹھے بیٹے کو کھانا کھلا رہا ہے جبکہ بیٹا اپنی خوشی کا مظاہرہ کررہا ہے! بھیروی دور کھڑی یہ منظر دیکھ رہی ہے!

شیوراج اپنے کمرے میں جاچکا ہے اور اُس کی گہری نیند کی تصدیق خراٹے کررہے ہیں!

میاں بیوی بھی کھاپی کراپنے کمرے میں آکر سوجانے کی تیاری کررہے ہیں!

بھیروی آخر پوچھ ہی بیٹھی کہ شیوراج کی ضد کو کس نے توڑا ہے؟

رشی نے اپنے بے ساختہ قہقہے کو دبوچ کر کہا ''نوشیرواں عادل نے!!''

بھیروی کو بھاسکر کی باتیں یادآ گئیں! بقول اس کے شیوراج نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک انصاف پسند بادشاہ اپنی رعایا کا حال جاننے کی خاطر، ہر رات بھیس بدل کر، لوگوں کے گھروں کے باہر، اندر ہورہی باتیں سنا کرتا تھا! بس نوشیرواں عادل کے کارناموں سے متاثر ہوکر، شیوراج نے دوسرے کے خطوط پڑھنے یا بند کمروں کے باہر، اندر ہورہی باتیں سن لینے کی عادت کواپنے سینے سے لگایا ہے!

بھیروی مسکراتی رہی، مگراچانک چونک پڑی!

تو کیااس کا سسر رات بھر جاگ جاگ کران کی باتیں سن رہاتھا!

شام ہوئی ہے! شیوراج اور رشی راج دونوں گہری نیند سورہے ہیں! ویسے ہی جیسے دوہم سفرایک لمباسفر طے کرنے کے بعد سورہے ہوں! بھیروی جاگ رہی ہے، راگ بھیروی کی طرح سکھ میں، دکھ میں، دن میں، رات میں، کسی بھی پہر میں اور کسی بھی موسم یاماحول میں باپ بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرچکی ہے! مگر یہ سوچ سوچ کر سمجھ نہیں پائی ہے اور سمجھ سمجھ کر سوچ نہیں پائی ہے کہ شیوراج نے شوق کی خاطر عادتوں کی ایک کھیتی پال رکھی ہے یا شوق ہی عادتوں کو پال رہاہے! کیاوہ اپنی ضد سے دونوں کے انوکھے پیار کا تحفظ کررہاہے!

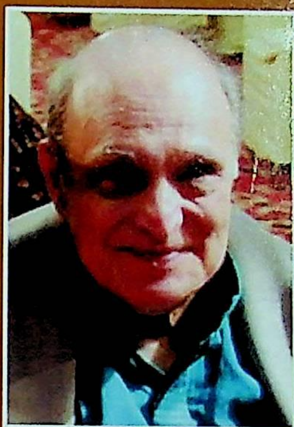
رشی اپنے باپ سے بے حد پیار کرتا ہے مگر شیوراج کی طرح وہ جنونی نہیں ہے! اور وہ ضدی بھی نہیں ہے!! یہ وہ جان گئی ہے!!!



TAMASHAI

by

Veerinder Patwari



ویریندر پٹواری اردو کے معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، اور فلم و ٹی وی اسکرپٹ رائٹر ہیں جو گزشتہ پچاس برس سے مسلسل اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا قلم اس دور میں سب سے زیادہ متحرک رہا جب اردو ادب پر جدیدیت کا غلبہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خود کلامی، علامتوں اور تشبیہوں کا اکثر استعمال ہوتا ہے۔ ان کے افسانے انسانی نفسیات اور معاشرے میں ہو رہی بدعنوانیوں سے کافی متاثر ہیں جسے وہ بہترین اسلوب سے کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ واقعات کو سمیٹنے اور انہیں سلیقے سے پیش کرنا ویریندر پٹواری کا خاص انداز ہے۔

ویریندر پٹواری نے اب تک 290 سے زاید اردو افسانے، 21 کشمیری افسانے، انگریزی میں 17 کہانیاں، 12 اردو ڈرامے جو شایع ہوئے، 13 ریڈیو ڈرامے، 7 ٹی وی پلے، 6 ٹیلی فلم، 18 ٹیلی سیریل اور ایک فلم کا اسکرپٹ لکھا ہے۔ اب تک ان کے 11 افسانوی مجموعے، ایک منتخب ڈراموں کا مجموعہ اور ایک ناولٹ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے 7 افسانوی مجموعوں پر دہلی یونیورسٹی، حیدر آباد یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی کے طالبوں نے ایم فل کے لیے تھیسز لکھا ہے۔

ویریندر پٹواری کو بہار اردو اکادمی (1988، 1996، 2007)، دہلی اردو اکادمی (2006، 2014) اور جموں و کشمیر اکادمی (2014) نے وقتاً فوقتاً ایوارڈ سے نوازا ہے۔

GNK PUBLICATIONS

www.gnkpublications.com
Email : gnkpublications@gmail.com
Mob : 7006738304, 9541123110



₹ 350.00